www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

आधी آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

आज़ादी का अमृत महोत्सव

G20 भारत 2023 INDIA

ستمبر 2023

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

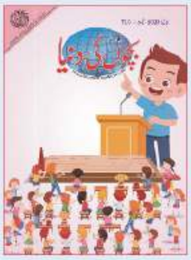

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

اردو آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 7 شمارہ: 9 ستمبر 2023

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: 64 Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

جہانِ نسواں

اردو افسانے میں نسوانی کردار — ابراہیم نثار اعظمی — 5

ابن کنول بحیثیت خاکہ نگار — ڈاکٹر آفرین شبر — 9

اردو ادب میں چہار بیت کا تاریخی اور سماجی پس منظر — ڈاکٹر گلشن مسرت — 13

محبت کی مورت: اسّو پھوپو — عزہ معین — 17

دبستان لکھنؤ کی چند ممتاز مرثیہ نگار خواتین — رانی حفیظ — 20

لکھنؤ کی چند اہم شاعرات — ڈاکٹر الطاف احمد میر — 24

منفرد زبان و بیان کا ناول ''ریت سمادھی'' — زیبا فاروقی — 28

کھانا اور اردو شاعری — ناہیدہ شبیر خان — 32

تامل ادب کے شاہکار 'کوی کو' عبدالرحمٰن: شخصیت اور فن — ایس۔ جی۔ انیسہ بیگم — 36

بیدی کے افسانہ یوکلپٹس کا نفسیاتی جائزہ — شاکرہ ضمیر — 38

نکہتِ سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 42

سائنس میں خواتین

سائنس میں مسلم خواتین — ڈاکٹر روبینہ — 43

خلائی افق کا آفتاب ہیں خواتین — آسیہ خان — 47

حسنِ سخن

ہاجرہ خاتون، ڈاکٹر عنبر عابد، میمونہ تحسین — 51

افسانہ

رشتوں کی مہک — ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک — 53

حیات الفت — فاضلہ الفت — 57

صحت

قبل از وقت مینوپاز — ڈاکٹر خان شہناز بانو — 59

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 62

مشعل

آج زندگی کے ہر شعبے میں خواتین ایک اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ خلائی سائنس ہو، تحقیق وتصنیف ہو، علم طب ہو یا دوسرے علوم وفنون خواتین نے ہر میدان میں اپنی شناخت مستحکم کی ہے۔ سائنس، ریاضی اور انجینئرنگ جیسے شعبوں میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان شعبوں میں وہ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ دلچسپی کے ساتھ کر رہی ہیں۔ گھر اور دفتر کی ذمہ داریوں کے علاوہ بھی وہ ہر میدان میں مردوں پر سبقت رکھتی ہیں۔

زمانۂ قدیم سے ہی معاشرتی ارتقا میں سائنس کا نمایاں کردار رہا ہے۔ طب کے شعبوں میں بھی خواتین نے اہم کام کیے ہیں۔ خواتین نے سائنس میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ سائنس خواتین کی سوچ میں تبدیلی لاتی ہے۔ جدید دور میں بہت سی خواتین سائنس کی دنیا میں کام کر رہی ہیں اور نئے نئے میدانوں کو کامیابی کے ساتھ سر کرنے میں لگی ہیں۔ ان کی تعداد مردوں کے برابر تو نہیں ہے لیکن وہ کوشش سے نئے نئے کارنامے انجام دے رہی ہیں۔

موجودہ دور میں بہت سی خواتین ایسرو (ISRO) سے جڑی ہوئی ہیں۔ خلائی ریسرچ میں بھی خواتین اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ سینکڑوں خواتین خلائی ریسرچ کے لیے انتھک محنت کر رہی ہیں۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق ایجادات کی عالمی فہرست میں خواتین کا مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں خواتین نے بہت سی ایجادات کی ہیں۔ انٹرنیٹ اور جدید ٹیکنالوجی نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اسماء چٹرجی، کمل رن دیوے، ای کے جانکی امال، کملا سوہنی، آنندی بائی گوپال راؤ جوشی، ڈاکٹر درشن رنگاناتھن، کلپنا چاولہ، مویتا دتہ، نندنی ہری ناتھ، انورادھائی کے، این ولار مستھی، مینل سنپت، کیرتی فوجدار اور ٹیسی تھامس وہ خواتین سائنس داں ہیں جنھوں نے سائنس کی دنیا میں نئی نئی ایجادات کی ہیں۔ حکومت بھی خواتین کے لیے آسانیاں فراہم کر رہی ہے۔ خواتین کے تئیں حکومت کا رویہ بیحد سنجیدہ ہے۔ عملی طور پر حکومت خواتین کے خوابوں کو نئی تعبیر فراہم کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ سائنس ٹیکنالوجی، ریاضی اور انجینئرنگ جیسے میدانوں میں خواتین اپنا مستقبل بنانے کی کوشش میں لگی ہیں۔ سائنس کی دنیا میں جن خواتین نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے ان کی تشہیر کی جانی چاہیے تاکہ ملک کی اور خواتین کے لیے وہ مشعل راہ بن سکیں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

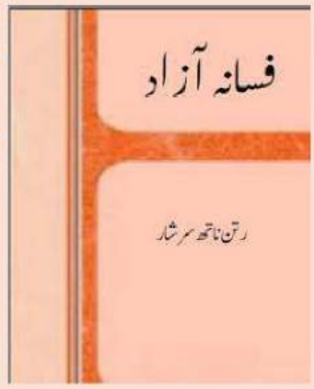

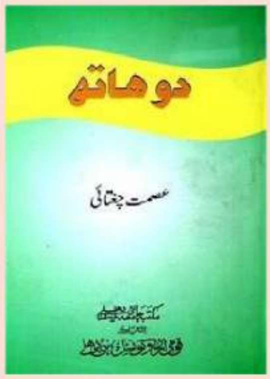

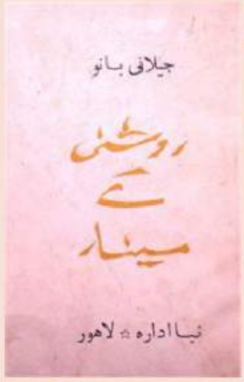

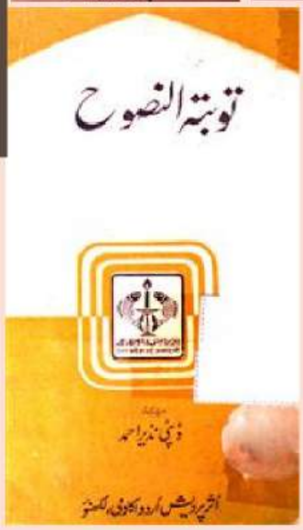

ابراہیم نثار اعظمی

اردو افسانے میں نسوانی کردار

تاریخ شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ سے قصے اور کہانیوں کا شوقین رہا ہے۔ ہر دور، ہر زمانے میں یہ شوق بتدریج ارتقا ہو گیا۔ کبھی اس شوق کو داستان کے ذریعہ پورا کیا گیا، تو کبھی ناول کی ورق گردانی کر کے پورا کیا گیا۔۔ قصے اور کہانیوں کا سب سے قدیم نام، داستان ہے۔ یہ اس دور میں رائج الوقت مانی جاتی تھی جب لوگوں کے پاس بے شمار فرصت کے لمحات ہوا کرتے تھے۔ وہ لوگ حقیقت سے زیادہ مافوق الفطرت عناصر پر یقین رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے پاس علم کی کمی تھی، جہل اور توہم پرستی عام تھی ان داستانوں کا محور جن، پری، بھوت اور اسی طرح کے غیر فطری عناصر ہوا کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ وقت نے کروٹ بدلی۔ لوگ علم سے آشنا ہونے لگے، مافوق الفطرت عناصر سے لوگ حقیقی دنیا کی طرف سفر کرنے لگے۔ آسمانی قصوں سے زمینی قصوں کی طرف رجحان بڑھنے لگا۔ اب داستان میں الجھنے کے بجائے ایک ایسے صنف ادب کی کمی محسوس کی جانے لگی جس کے نتیجے میں ناول کا وجود عمل میں آیا۔

ناول نے بلا شبہ افسانوں کو حقیقی دنیا کا سفر کرایا مگر جس برق رفتاری سے ناول نے ترقی کی، اس سے کہیں زیادہ تیز وقت اور زمانے نے تغیر و تبدل کا لبادہ زیب تن کیا۔ بدلتے ہوئے زمانے کی طوالت گراں گزری۔ چونکہ یہ دور مشینوں اور ٹیکنالوجی کا دور تھا۔ عوام کی زندگی مصروفیت کی نذر ہو چکی تھی اب ہر شخص وقت کی کمی پر نالاں تھا۔

اسی وقت کی قلت نے ناول کی طوالت کا راگ بلند کیا اور ایک ایسی صنف کی مانگ کرنے لگا جہاں قصے تھے۔ جس میں کہانی کا شوق بھی پورا ہو جائے اور وقت کی بچت بھی ہو جائے۔ اسی مشینی دور اور وقت کی قلت نے ''افسانے'' کو ادب کی کوکھ سے جنم دیا۔

افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ افسانہ بے شک انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کا خاتمہ وحدت تاثر پر ہوتا ہے۔ افسانے کے وجود میں آنے سے وقت کا رونا کم ہو گیا۔ اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں رکھی گئی۔ ہاں البتہ افسانہ اتنا مختصر ہوا کہ ایک بیٹھک میں پڑھا جا سکے اور اس کے مکمل ہونے کی کیا میعاد ہونی چاہیے، اس سلسلے میں مختلف نقادوں کی کیا رائے ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ افسانے نے داستان اور ناول کے بعد ادب و دنیا میں قدم رکھا ہے۔ اپنی تمام تر خصوصیت کی بنیاد پر بہت تیزی سے ترقی کے منازل طے کرتا چلا گیا۔ سب کچھ جان لینے کی جستجو انسان کے مزاج کا حصہ رہا ہے۔ انسانی زندگی میں تفریحات کی اہمیت کو نظر انداز نہیں

کیا جا سکتا ہے، ہاں اس کے ذریعے سے وقتی سکون ضرور حاصل ہوتا ہے۔

انسانی تاریخ کا سلسلہ انتہائی دراز ہے۔ انسانی ارتقاء جب سوچنے سمجھنے کے مرحلے پر پہنچا۔ تو فکری لذت اندوزی، ذہنی تازگی کے لیے مختلف ذرائع کا استعمال کرنے لگا۔ ذہنی و جسمانی تھکان سے نجات، تکلیف دہ حالات سے وقتی فرار کے لیے اس کو ذریعہ بنایا گیا۔ وقت آگے بڑھا انسان تہذیب کے دور میں داخل ہوا۔ تو تفریح کو غیر شعوری طور پر وہ رنگ ملنے لگا جسے بعد میں ادب کا ایک حصہ قرار دیا گیا۔

اردو ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب میں داستانوں کی ابتداء اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہو چکی تھی۔ جب پورا معاشرہ ایک عجیب بے بسی کا شکار تھا تو اس نے راہ فرار میں سکون تلاش کیا۔ حساس طبیعت کے لوگ اس میدان میں عملی جوہر دکھانے کے بجائے خیالات کے تانے بانے بننے میں مصروف ہو گئے اور اٹھارہویں صدی کے آخری دور میں داستان اپنے تمام تر ابتدائی مراحل سے گزر کر عروج کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے اردو ادب میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ تقریباً تین صدیوں میں اردو ادب کے اندر نظم و نثر کے بے شمار قصے اور کہانیوں کی کتابیں وجود میں آ چکی تھیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یورپی اثرات کے تحت داستان گوئی کا قدیم طرز تحریر متروک ہو گیا اور انسان کی واقعاتی زندگی کو موضوع بنایا جانے لگا۔ لہٰذا یہ سب قصے اس زمانے تک محدود ہیں، جب اردو زبان و ادب پر انگریزوں کا اثر پڑنا شروع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد افسانوی ادب میں مختصر افسانے کا وجود ہوا۔ یہ مختصر افسانہ اردو ادب کے افسانوی ادب کا وہ پہلو ہے جس پر ہمیں اپنی توجہ مرکوز کرنی ہے۔

ناول کی طرح مختصر افسانہ اردو میں مغربی تہذیب اور ادب کے توسط سے آیا ہے۔ مختصر افسانے کی شروعات اس وقت ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی، معاشرتی، اور اخلاقی حیثیت سے انتشار پھیلا ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری دہوں میں مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب افسانے کا آغاز ہوا۔ ناول کی طرح مختصر افسانہ بھی اردو میں مغربی تہذیب کی راہ سے آیا۔ مختصر افسانے کی عمر بہت لمبی نہیں۔ اس کا آغاز انیسویں صدی میں اس وقت ہوا جب صنعتی انقلاب نے انسان کی مصروفیات میں اضافہ کر دیا تھا لیکن قصے کہانی کا شوق اسے مجبور کرتا تھا، کہ وہ وقت کی تنگی کے باوجود کسی ایسی صنف کا مطالعہ کرے جو ناول کی طرح دلچسپ ہونے کے باوجود مختصر بھی ہو۔

''پروفیسر محمد نجیب نے صحیح کہا ہے کہ ''انیسویں صدی کے وسط سے واقعیت کی تحریکیں شروع ہوئی تو عیش کا طلسم کچھ کم ہوا، کمزور ہوا، ایسا تجربہ انسان کی عام زندگی نے بتایا کہ عاشق ہو جانا محض رئیسوں اور خوشحال لوگوں کی ایک دلچسپی ہے۔ اس احساس نے داستانوں کی وقعت تو بہت کم کر دی، لیکن ناول افسانے پھر بھی اس بنیاد پر تعمیر ہوتے رہے''۔

(اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، ڈاکٹر صغیر افراہیم۔ ص 28۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1991)

اردو ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب میں داستانوں کی ابتدا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ھوچکی تھی۔ جب پورا معاشرہ ایک عجیب بے بسی کا شکار تھاتو اس نے راہ فرار میں سکون تلاش کیا۔حساس طبیعت کے لوگ اس میدان میں عملی جوھر دکھانے کے بجائے خیالات کے تانے بانے بننے میں مصروف ھو گئے اور اٹھارھویں صدی کے آخری دورمیں داستان اپنے تمام تر ابتدائی مراحل سے گزر کر عروج کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔

افسانہ ہو یا ناول اس کا لکھنے والا انسانی زندگی کی ایک تصویر پیش کرتا ہے اور افسانہ نگار کا مطلب عبرت اور سبق دینا مقصد ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہنسانا اور خوش کرنا، اور افکار و خیالات میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے۔

ناول کی طرح مختصر افسانے نمونے بھی پریم چند سے بہت قبل رسالہ ''دلگداز'' اور'' اودھ پنچ''، ''معارف ''علی گڑھ''، ''قانون'' خدنگ نظر (لکھنو)'' ''مخزن'' ''بیسویں صدی (لاہور)'' اور دوسرے اردو رسائل میں ملتے ہیں۔ اس وقت انگریزی افسانوں کے تراجم بھی سامنے آنے لگے تھے۔ پریم چند سے قبل بہت سے ادیبوں نے مغربی افسانے کے فن اور تصور سے اردو افسانے کو روشناس کرا دیا تھا۔ ان میں بالخصوص سجاد حیدر یلدرم'' سلطان حیدر

جوش، علامہ راشد الخیری'' اور علی محمود بانکی پور کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں وحدت تاثر رکھنے والے حقیقت پسندانہ افسانوں کا رنگ بھی نمایاں ہے اور مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کہانیاں، مختصر افسانے مغربی افسانے کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں بعض کہانیوں میں تکنیک کی دلکشی اور جدت وندرت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

قدیم طرز کی کی افسانہ گوئی کا دور سرشار اور ڈپٹی نظیر احمد کی طرز تحریر کی ابتدا سے ہوا تھا۔ ان کی کتابوں نے ہندوستان میں معاشرتی اور مذہبی اصلاح کی۔ اس سلسلہ میں رتن ناتھ سرشار کی مشہور کتاب ''فسانہ آزاد'' ''نذیر احمد کی توبۃ النصوح'' ''ابن الوقت'' بنات النعش اور مراۃ العروس'' اخلاقی زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں سے تمام کتاب مذہب، اخلاق اور معاشرت کی اصلاح کا آئینہ ہونے کے باوجود دہلی کے متوسط طبقے کی زندگی کا سچا اور بے لوث مرقع ہے۔ اس دور کے ادیبوں نے اس بدلتی ہوئی فضا کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور دانشمندی کا مظاہرہ کیا جس کے پیش نظر ادب کے نئے اور وسیع تقاضے مرتب ہوئے۔

بیسویں صدی کا آغاز اردو افسانے کی ابتدا قرار دیا جا سکتا ہے۔ ناول کی طرح اردو افسانہ بھی انگریزی کے زیر اثر معرض وجود میں آیا۔ اسی افسانے سے مختصر افسانے کی ابتدا ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی، معاشرتی، اور اقتصادی انتشار پھیلا ہوا تھا۔ قومی وسیاسی رہنماؤں نے اپنی تحریکوں کے ذریعہ سے عوام کو مٹتے ہوئے تہذیب وتمدن سے آگاہ کیا، مغربی تہذیب کی بڑھتی ہوئی اثر اندازی کے خطرے سے عوام کو ہٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب مختصر افسانہ وجود میں آیا۔ پریم چند اردو افسانہ نگاروں میں سب سے پہلے اس بات کو محسوس کیا، انھوں نے اپنی زندگی کی باعظمت قدیم تصویروں میں نیا آب ورنگ پیدا کیا۔ جن چیزوں کو لوگوں نے افسانہ سمجھ کر بھلانا شروع کر دیا تھا۔ پریم چند نے انھیں نئے انداز میں پیش کیا۔ راجپوتوں کی زندگی سے افسانوں کے پلاٹ حاصل کر کے وطن پرستی کا جذبہ پیدا کیا، بقول سلاحت اللہ خان:

> ''تاریخی اعتبار سے 1900 کے معارف میں شائع ہونے والا اردو کا پہلا افسانہ سجاد حیدر یلدرم کا تھا۔ لیکن جدید اردو افسانہ کے موجد پریم چند ہیں اور ان کی رہنمائی میں ہی اردو افسانے نے موضوع وفن دونوں لحاظ سے حیرت انگریز ترقی کی ہیں''۔

(اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، ڈاکٹر صغیر افراہیم۔ ص 28۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (1991

پریم چند نے اردو افسانے میں صحیح انداز کی کردار نگاری کا رواج پیدا کیا۔ اسی لیے عوام پریم چند کو اردو کی مختصر افسانہ نویسی کا موجد قرار دیتے ہیں۔

پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم دو مختلف مکتبۂ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمن اعظمی ایک جگہ پر یوں لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک سے پہلے اردو میں مختصر افسانہ نگاری کے دو واضح میلانات ملتے ہیں ایک حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کا، جس کی قیادت پریم چند کر رہے تھے۔ اور دوسرا رومانیت اور تخیل پرستی کا جس کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم کر رہے تھے''۔

(اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، از ڈاکٹر صغیر افراہیم ص 31) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ)

کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی وغیرہ افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ جیسے کرشن چندر نے ''زندگی کے موڑ پر'' ''ان داتا'' ''کالو بھنگی'' اور ''میں انتظار کروں گا'' وغیرہ ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے ''گرم کوٹ'' ''اور ایک چادر میلی سی'' جیسے افسانے لکھ کر قاری کو چونکا دیا۔ اسی زمانے میں سعادت حسن منٹو کی آمد جدید اردو افسانے میں ایک نیا موڑ لاتی ہے۔ منٹو کے آنے سے اردو افسانہ مصنوعی اور اخلاقی

زنجیروں سے آزاد ہوگیا۔ان کا مشہور افسانہ''بانجھ''''ٹھنڈا گوشت''''کالی شلوار''''خالی ڈبے''اور''نیا قانون''، وغیرہ منٹو کے اعلی درجے کے افسانے شمار کیے جاتے ہیں۔

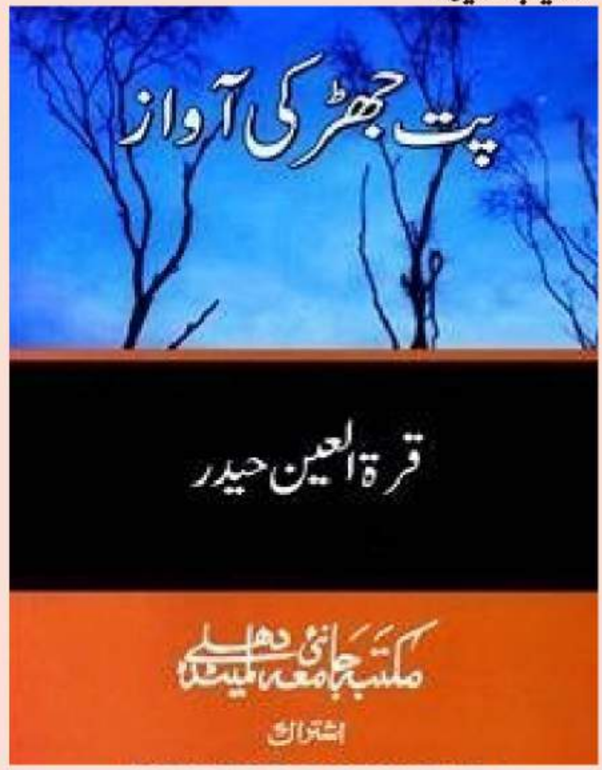

اسی دور میں حیات اللہ انصاری ،احمد ندیم قاسمی ،محمد حسن عسکری، خواجہ احمد عباس ،ممتاز مفتی ،آغا بابر جیسے افسانہ نگار ابھرے۔بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ابھرنے والے اہم افسانہ نگاروں میں کچھ خواتین افسانہ نگار بھی ہیں۔جنھوں نے اپنے افسانوں میں خواتین کی نمائندگی کو پیش کیا ہے اورجنسی ،رومانی ،سیاسی ،مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ان خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی ،ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور،خدیجہ مستور،اور قرۃ العین حیدر وغیرہ شامل ہیں۔قرۃ العین حیدر نے 1944 کے آس پاس اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا۔''سیتا ہرن'' ''پت جھڑ کی آواز''''اور''ہاؤسنگ سوسائٹی'' جیسے افسانے لکھ کر اردو افسانے کی دنیامیں نام پیدا کیا۔جس سے اردو ادب کا دامن وسیع ہوا۔

جیلانی بانو''روشنی کی مینار''''ستی ساوتری'' جیسی تخلیقات کو منظر عام پر لائیں۔واجدہ تبسم حیدرآباد کی ہیں انھوں نے حیدرآباد کے بارے میں لکھا ہے لیکن واجدہ تبسم کی شہرت''اُترے رود موسی''اور''شہر ممنوعہ'' جیسے افسانوں کی وجہ سے ہوئی ہے ۔مذکورہ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی کو اولیت حاصل ہے ۔ان کے کچھ ایسے افسانے ہیں جن میں ''کلیاں ،چوٹیں ،چھوئی موئی ،دو ہاتھ''(افسانوی مجموعے) کی وجہ سے انھیں صف اول کا افسانہ نگار تسلیم کیا جا چکا ہے۔''ہندوستان چھوڑ دو''، ''لحاف''اور''پیشہ'' وغیرہ افسانوں نے عصمت چغتائی کو اردو ادب میں بے مثال مقبولیت عطا کی ہے۔پروفیسر وقار عظیم ایک جگہ پر لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو کے افسانہ نگاروں میں صرف عصمت چغتائی ہی ایسی افسانہ نگار ہیں جن ہوں نے افسانوں کے ذکر اور تصور سے کچھ لوگوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔اور دوسری طرف کچھ لوگوں کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ان میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ ان کے افسانوں کے ذکر سے مسرت حاصل کرتے ہیں۔چند ایسے بھی ہیں کہ عصمت کے افسانوں کا نام سنتے ہی ''لاحول'' پڑھنے لگتے ہیں''۔

(نیاافسانہ،سید وقار عظیم،ص124،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ)

اگرچہ اردو ادب کی اصناف نثر میں داستان ،ناول کے مقابلے میں افسانے کی مدت بہت مختصر ہے لیکن ان تمام افسانوں میں عورت کے حوالے سے ایک طویل پس منظر موجود ہے۔اس طرح سے اردو افسانوں میں عورت کے تصور یا نسوانی کردار کے بہت سے روپ بیان کیے گئے ہیں۔نسوانی کردار ہو یا مردانہ کردار دونوں کا مقام علیحدہ متعین ہے۔کردار کے تعلق سے جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات بالکل عیاں ہوتی ہے کہ اردو افسانوی ادب میں عورت کے مختلف روپ مثلاً: ماں ،بیوی، بہن ،محبوبہ،اور طوائف نیز ہر پہلو پر معقول اور تفصیلی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

کتابیات

1 نیا فسانہ''سید وقار عظیم،ص124،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

2 اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل ،از ڈاکٹر صغیر افراہیم ص31)ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

3 اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل،ڈاکٹر صغیر افراہیم،ص28 ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ1991)

4 (اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل،ڈاکٹر صغیر افراہیم،ص28،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ1991)

Ibrahim Nisar Azmi

538 Waqas Villa Edden Enclave

Gudamba tha kursi Road

Lucknow-226021 (U.P)

9611954067

ابنِ کنول بحیثیت خاکہ نگار

ڈاکٹر آفرین شبر

ابن کنول کی پہچان اردو ادب میں ایک نمایاں افسانہ نگار کی ہے۔اس کے علاوہ معاصر ادب میں اُن کے تجزیاتی مضامین تحقیقی کاوشات اور مرتبین کی حیثیت سے بھی ابن کنول کو اردو دنیا جانتی اور مانتی ہے۔دورانِ کووڈ ابن کنول کے کئی اپی سوڈ یوٹیوب اور فیس بک پر ویڈیو کے روپ میں منظر عام پر آئیں جن میں وہ اردو ادبا پر خاکے پڑھتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ ادبی شخصیات پر لکھیں یہ خاکے کتابی شکل میں 'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' کے روپ میں منظر عام پر آئی۔جس میں کل 25 خاکے شامل ہیں۔ان میں سے ایک خاکہ ادارتی خاکہ ہے جو 'منٹو سرکل' کے نام سے اس میں موجود ہے۔اس کے علاوہ سبھی خاکے اشخاص پر مبنی ہیں۔ابن کنول نے اس مجموعے میں ان سبھی اشخاص کے خاکے قلم بند کیے ہیں جن سے ان کی دلی وابستگی تھے ۔ان خاکوں کے لیے وہ اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں :

''اس نظر بندی میں مجھے میرے اپنے یاد آئے ،جن سے میرا خون کا رشتہ نہیں لیکن دل کا رشتہ تھا اور دل کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہوتا ۔میں نے انھیں قلم کے ذریعہ یاد کرنے کا فیصلہ کیا۔12 اپریل کو ''داستان کی جمالیات'' کا پیش لفظ لکھ کر کتاب مکمل کی اور 14 اپریل سے خاکے لکھنا شروع کر دیے۔سب سے پہلے اپنے پرائمری اسکول کے استاد کو یاد کیا، پھر اسکول کے ہم جماعت کی یاد آئی ۔پھر علی گڑھ اور دہلی کے اساتذہ اور دوستوں کو یاد کیا۔''

(کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی ،ابن کنول،ص9)

اس مجموعے میں قاضی عبدالستار، پروفیسر قمر رئیس ،تنویر علوی، گوپی چند نارنگ ،حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، محمد عتیق صدیقی، قرۃ العین حیدر جیسی قد آور شخصیات پر قلم اُٹھانے کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عصروں کو بھی اپنی فکر و نظر کا حصہ بنایا جن میں علی احمد فاطمی، فاروق بخشی ، پیغام آفاقی، پروفیسر ارتضٰی کریم، خواجہ محمد اکرام الدین ، پروفیسر اے رحمٰن ، محمد زماں آزردہ کی شخصیات شامل ہیں۔ابن کنول نے نئی نسل کے لکھنے والوں کو بھی اپنے اس مجموعے میں قلم بند کیا ہے۔ محمد کاظم اور نعیم انیس کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی علمی و ادبی فعالیت کا اعتراف کیا ہے۔

ابن کنول نے اول تو اپنے اساتذہ کے خاکے بڑی ہی عقیدت مندی سے تحریر کیے ہیں۔ان کی تصویر کو اس طرح ابھارا ہے کہ وہ ایک خوبصورت شکل اختیار کر لیتی ہے۔خاکوں کا عنوان اشخاص کے نام سے ہی ہوتا ہے ۔ان کے پرائمری اسکول کے استاد کا نام منشی چھٹن تھا۔اسی نام

سے ان کا خاکہ تحریر کرتے ہیں۔اس میں خاکہ نگار نے اپنے بچپن کی بہت سی یادوں کو قلم بند کیا ہے ساتھ ہی اپنے استاد کی شخصیت کو ایک خوبصورت رنگ دے کر ابھارا ہے۔راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ خاکہ ابن کنول کے دل کے بہت قریب ہوگا،جس میں ان کے بچپن کی بہت سی یادیں موجود ہیں۔اپنے استاد کا حلیہ کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> ''چوڑی موری کا پاجامہ اس کے اوپر بوشرٹ پہنتے تھے۔ سردیوں میں اس کے اُپر کوٹ پہن لیتے تھے اور گلے میں مفلر ڈال لیا کرتے تھے۔پاس ہی کسی گاؤں کے رہنے والے روز سائکل سے آیا کرتے تھے۔دراز قد سانولا رنگ، گھنے بال، پرانی فلموں کے ہیرو جیسے لگتے تھے،دوسرے استاد سے مختلف تھے۔'' (ایضاً،ص14)

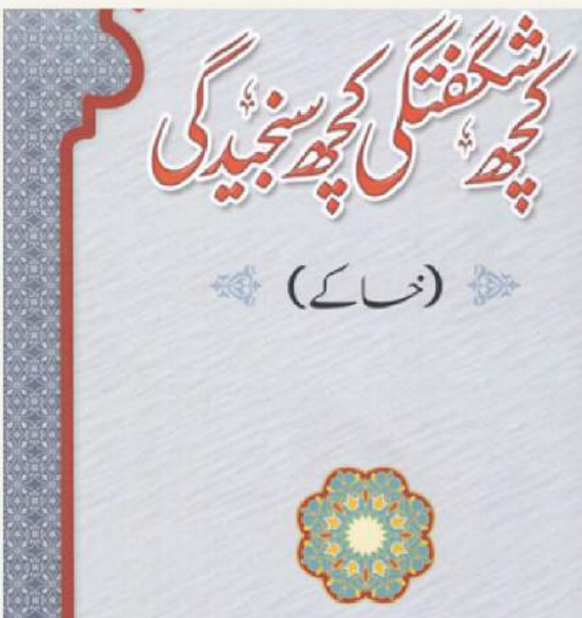

اس اقتباس میں اپنے استاد کا حلیہ اور ان کے رنگ و روپ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے پہناوے کا ذکر کیا ہے۔وہ اپنے استاد سے بے حد متاثر تھے اس لیے ان کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں کا ذکر بھی اس میں کرتے ہیں۔اس خاکے کی ابتدا خاکہ نگار علی گڑھ اور دہلی سے اپنے گاؤں کی دوری بتاتے ہوئے کرتے ہیں۔اس میں ایک خوبصورت تمہید موجود ہے جس کے بعد اپنے استاد کا ذکر کرتے ہوئے ان سے قاری کو متعارف کرواتے ہیں۔خاکہ کے آخر میں خاکہ نگار کا عقیدت مندانہ رویہ دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''دہلی آئے ہوئے بھی چار دہائیوں سے زیادہ وقت گزر گیا لیکن چھٹن جی کا چہرہ اور ان کی باتیں اب بھی یاد ہیں۔سنا ہے وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔میرے ذہن میں وہ ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ان کی وہی صورت اور وہی مشفقانہ باتیں مجھے یاد دلاتی رہتی ہیں۔انسان بچھڑ جاتا ہے لیکن اس کا کردار اسے زندہ رکھتا ہے۔'' (ایضاً،ص16)

یہ ایک شاگرد کا اپنے استاد سے بے پناہ محبت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔خاکے اکثر شخصیات کے لکھے جاتے ہیں ادارتی خاکے بہت کم لکھے گئے۔ابن کنول نے ادارے پر بھی خاکہ لکھا یہ خاکہ ان کی ابتدائی درسگاہ کا ہے۔یہ علی گڑھ کی وہ درسگاہ ہے جہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا آغاز ہوتا ہے۔ابن کنول نے اس میں اپنے طالب علمی کے زمانے کو قلم بند کرنے کی پوری کوشش کی ہے جوان کو ناصر محمود سے ''ابن کنول'' بناتا ہے۔اس لیے اپنے دوست اساتذہ سب کا ذکر ہے۔اس میں کئی ایسے واقعات کا ذکر بھی ہے جو طالب علمی کے زمانے میں پیش آتے ہیں جن کے صرف یاد کرنے سے ہی فضا خوشگوار ہو جاتی ہے۔ابن کنول ایسے ہی چند واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> ''علی گڑھ میں بعض اساتذہ اور سینئر طلباء کی شخصی صفات کی بنیاد پر اُن کے نئے اضافی نام بھی رکھنے یا خطابات سے نوازنے کا بہت رواج ہے۔مثلاً منٹو سرکل میں وصی ابا،تقی پوتڑا،افضال تھیلا جی،یونیورسٹی میں جب حسرت موہانی پان کا بٹوا لے کر آئے تو طلباء نے انھیں خالہ جان کہنا شروع کر دیا بعد میں مولانا کے نام سے مشہور ہوئے۔دیگر نامور شخصیات میں مسعود ٹامی، مختار گھوڑا،بصیر گٹا،نفیس بکرا، اقبال، برولا،کمال انڈا،وسیم بھنڈی وغیرہ شامل ہیں۔''

(ایضاً،ص20)

اس اقتباس سے اس وقت کے علی گڑھ کے رواج کی معلومات ہوتی ہے۔ساتھ ہی اپنے طالب علمی کے زمانے میں کس طرح کا وقت ابن کنول نے گزارا اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔یہ اپنے طالب علمی کے زمانے کی وہ یادیں ہیں جو خاکہ نگار کو بھی جاننے اور علی گڑھ کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔

''داستان گو قاضی عبد الستار'' کے نام سے اپنے استاد قاضی عبد

الستار کا بھی خاکہ قلم بند کیا ہے جس میں ان کا سراپا اس قدر پیش کیا ہے جیسے کسی بادشاہ کی آمد ہو۔ ملاحظہ ہو:

''نقیبوں کی رعب دار آوازیں بلند ہوئیں۔ سب سے دولت مند اسلوب کے سب سے جلیل الشان شہنشاہ کے طلوع کا اعلان کیا۔ میانہ قد، چھریرہ بدن، کشادہ پیشانی، دراز زلفیں، کتابی چہرہ، گندمی رنگ، بادامی رنگ کی شیروانی چوڑی دار پاجامہ، پشاوری سینڈل، شاہانہ انداز کے ساتھ جیسے ایک ایک قدم سلطنت پر پڑ رہا ہو۔'' (ایضاً،ص24)

اس سے ایک بادشاہ کی آمد محسوس ہوتی ہے جب کہ یہ صرف اپنے استاد کو قاری سے متعارف کروانے کی ابتدا تھی ۔ یہ خاکہ نگار کا موضوع شخصیت پر اپنے ذاتی مشاہدات کا ہی ثبوت ہے جو اس اقتباس میں محسوس ہوتا ہے ۔ قاضی عبدالستار کے علاوہ'' قمر رئیس ،تنویر احمد علوی ، گوپی چند نارنگ ،عنوان چشتی'' جیسے اساتذہ کو خاکہ نگار نے اپنا موضوع قلم بنایا۔

ان اساتذہ کے خاکوں میں سب سے طویل خاکہ 'قمر رئیس' کا ہے جو 19 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک طرح کا سوانحی نوعیت کا خاکہ ہے جس میں خاکہ نگار نے اپنے استاد سے متعلق بیشتر واقعات کا ذکر کیا ہے ۔ایک شاگرد کی اپنے استاد سے محبت جا بجا اس میں نظر آتی ہے ۔اس خاکے کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں خاکہ نگار نے اپنے استاد کی اس عام شخصیت سے بھی قاری کو روبرو کروایا ہے جو ایک بڑے انسان میں چھپی ہوئی ہے۔

قمر رئیس کی پر کشش اور فعال شخصیت، ان کے عادات واطوار اور ان کی ادبی شخصیت کا ذکر بھی اس خاکے میں ملتا ہے۔ ابن کنول رقم طراز ہیں :

''اردو میں قمر صاحب واحد نقاد تھے جو پریم چند تنقید کے لیے پہچانے جاتے تھے۔ پریم چند سے انھیں عقیدت سی ہوگئی تھی ۔انھوں نے علی گڑھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں پریم چند کے ناولوں پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ جو اسی زمانے میں علی گڑھ سے شائع بھی ہوا۔ آج تک اردو میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ علی گڑھ میں قمر صاحب اساتذہ اور طلباء میں بہت مقبول رہے۔...... قمر صاحب علی گڑھ میگزین کے مدیر بھی رہے 1959 میں دہلی یونیورسٹی کا شعبہ اردو اپنی انفرادی شکل میں قائم ہوا اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے تو انھوں نے گوپی چند نارنگ اور قمر رئیس کا شعبہ میں تدریسی خدمات کے لیے انتخاب کیا۔ 1997 میں اسی شعبہ سے سبکدوش ہوئے۔''

(ایضاً،ص47)

اس اقتباس سے موضوع خاکہ کی ادبی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے ۔ان کی ادبی خدمات اور ادبی زندگی سے قاری روبرو ہوتے ہیں ۔اس میں خوبیاں اور خامیاں دونوں کا ذکر ملتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ابن کنول نے اپنے استاد کی پوری زندگی ان چند صفحات میں قید کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

اپنے دوسرے اساتذہ میں گوپی چند نارنگ کا خاکہ اہم ہے یہ خاکہ بھی قمر رئیس کے خاکے کی طرح طویل وتفصیلات لیے ہوئے ہے۔ خاکہ نگار کے دہلی آنے کے بعد گوپی چند نارنگ سے بھی تعلقات بڑھتے گئے اور یہی وجہ ہے کہ اپنے دلی تاثرات کو ابن کنول نے قلمی رنگ دیا۔ نارنگ صاحب کی شخصیت سے متعارف کروانے سے پہلے جو تمہید باندھی اس میں قلم کے جوہر کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ابن کنول فرماتے ہیں:

''جب اسکول سے نکل کر علی گڑھ کے شعبہ اردو میں آئے تو اردو اور اردو والوں کی سیاست کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ۔اور 1978 میں دہلی آکر تو اردو کا پارلیمینٹ ہی دیکھ لیا۔ یہاں تو باقاعدہ آزادانہ حکومتیں قائم تھیں۔ کہیں پانی پت کا میدان تھا کہیں پلاسی کی جنگ تھی ۔کہیں بکسر کی لڑائی۔ ہمارے لیے بڑی مشکل تھی۔ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر''۔ (ایضاً،ص72)

اس اقتباس سے ادبی دنیا کی سیاست کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔جو ایک سچائی ہے اور اسی سچائی کو ایک قلمی روپ دے کر خاکہ نگار نے بہت سی باتیں کہہ دیں ۔ جب کوئی خاکہ نگار اپنے دلی تاثرات کو قلمی روپ دیتا ہے تو اس شخصیت کے بیان کے ساتھ ساتھ اپنا بیان بھی کرتا ہے جس سے اس کی خود کی شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کے خاکے میں خاکہ نگار کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے کہ قمر رئیس کے خیمہ کا ہونے کے باوجود بھی گوپی چند نارنگ سے تعلقات کا ذکر اس میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں :

''ابا نے کہا تھا تینوں کا احترام کرنا، حالات کہہ رہے تھے کسی ایک کا ہو جا۔ ہم ٹھہرے اصل گُل پر چلنے والے آدمی ۔یعنی گُل سے صلح رکھو۔ نظریہ اپنا رکھو نہ کا ہو سے بیر رکھو، نہ کاہو سے دشمنی۔ اساتذہ کے اختلافات میں اکثر طلباء کا نقصان ہو جاتا ہے۔ ہم نے ابا کا کہنا مانا اور تینوں کا احترام کیا اور تھے بھی لائق احترام۔'' (ایضاً)

اس مجموعے میں عصمت چغتائی کا خاکہ ایک مختصر انداز لیے ہوئے ہے۔جس میں عصمت چغتائی سے چند ملاقاتوں کا ذکر کیا گیا۔اسی فہرست میں عینی آپا کا خاکہ بھی آتا ہے۔

ابن کنول نے اس مجموعے میں اپنے کئی دوست اور احباب کے خاکے بھی لکھیں ہیں جن میں فاروق بخشی ،علی احمد فاطمی ، پیغام آفاقی ،ارتضیٰ کریم کے خاکے اہم ہیں ۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کا خاکہ غضنفر نے بھی لکھا ہے۔مگر ابن کنول نے جس دیدہ ریزی اور شعور کی کارفرمائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے علی احمد فاطمی کے ادبی سفر میں اُن کے نظریات ،ان کی فہم ،ترقی پسند تحریک اور نظریے سے علی احمد فاطمی کی وابستگی اور ان کے تنقیدی رجحان کے اوصاف کے باہم اُن کی زندگی کا مقصد ومنصب ،وژن اور مشن وغیرہ کو ابن کنول نے اپنے خاکہ میں اس طرح سے بیان کیا ہے کہ پروفیسر علی احمد فاطمی کے سوانحی حالات ،تعلیم و تربیت ،ادبی محرکات اور مکافاتِ عمل کا ایک خوشنما نقشہ تصور میں اُبھر آتا ہے۔جس کے تمام نقوش واضح اور پُر لطف نظر آتے ہیں ۔اس کے ساتھ اگر شخصیت میں کہیں ابن کنول کو جھول نظر آتا ہے تو وہ خاکے میں اس کو ظاہر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے مگر یہ جھول اس قدر سبک سری لہجہ اور نرم روفضا کے باہم ان کے قلم سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو قاری کو اور نہ ہی شخصیت کو گراں گزرتا ہے۔گویا بات کہیں بھی ہو سچائی کتنی ہی کڑوی ہو بہ حسن وخوبی اگر بیان کرنا آتی ہے تو وہ خاکہ نگار کا امتیازی وصف ہے کیونکہ خاکہ مبالغہ سے دور حقیقت کے قریب اور جمالیات سے پُر ہونا لازمی ہے۔یہ تینوں اوصاف ابن کنول کے اس خاکے میں موجود ہیں اور اُن کے ہر خاکے میں اس طرح کی ادبی فضا ملتی ہے جو خاکہ نگاری کے لیے اہم اور ضروری ہے۔

ان کے علاوہ کچھ نئے دور کی ادبی شخصیات بھی اس مجموعے میں نظر آتی ہیں جن میں خواجہ محمد اکرام الدین ،محمد کاظم ،عظیم صدیقی ،نعیم انیس ،محمد شریف قابل تعریف ہیں۔

''نصف صوفی :خواجہ محمد اکرام الدین'' کے عنوان سے خواجہ محمد اکرام الدین کا خاکہ تحریر میں لاتے ہیں جس میں کہیں کہیں مزاح کے رنگ بھی نظر آتے ہیں جو اس کی خوبصورتی اور بڑھا دیتے ہیں۔اس میں خواجہ اکرام الدین کے خواجہ ہونے کا ذکر لطیفانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔فرماتے ہیں:

> ''ہمارے ایک عزیز ہیں کہ جن کا نام خواجہ اکرام الدین ہے۔دین داری اور دنیاداری دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔یوں تو عمر میں ہم سے کافی چھوٹے ہیں۔لیکن نام ایسا رکھ لیا کہ بلا وجہ احترام کرنا پڑتا ہے۔والدین نے محمد اکرام الدین نام رکھا آپ نے دور اندیشی دکھائی اور اس میں ہوش سنبھالتے ہی خواجہ کا اضافہ کر لیا۔اب ہر چھوٹے بڑے کو خواجہ صاحب کہنا پڑتا ہے۔اور جو ان سے نہیں ملا ہے وہ بزرگان دین کی طرح احترام کرتا ہے۔'' (ایضاً،ص216)

ابن کنول بخوبی جانتے ہیں کہاں کس طرح سے کیسے قاری سے مخاطب کروانا ہے۔اسی لیے اپنے عزیز کا بیان اس خوبصورتی اور لطف اندوز طریقے سے کرتے ہیں کہ ایک خوشنما ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور قاری آخر تک خاکہ نگار کے ساتھ رہتا ہے۔اس خاکہ میں موضوع خاکہ کا بیان تہہ در تہہ اس سلیقہ مندی سے کرتے ہیں کہ خواجہ کی بااخلاق شخصیت، اپنے سے بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے محبت ان کو اپنے دوسرے ہم عصروں میں منفرد کرتی نظر آتی ہے۔

ابن کنول نے اکرام الدین کے خواجہ بننے سے پہلے ،اس کے بعد اور ادبی دنیا میں آنے تک کا سفر بڑی ہی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔کہیں بھی بھرتی کی تحریروں سے شخصیت کو خواہ مخواہ ابھارنے کی کوشش نہیں کی۔اس کے برعکس چھوٹے چھوٹے واقعات اور بظاہر معمولی نظر آنے والی عام باتوں کے حوالے سے جو کردار ابھارا ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔

ابن کنول نے سبھی موضوع شخصیات کے ساتھ انصاف کیا ہے جہاں ان کی خوبیوں کو بتایا ہے وہیں ان کی خامیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔لیکن کہیں کہیں واقعات طویل ہو جاتے ہیں اور خاکہ نگار موضوع سے ہٹ جاتا ہے۔جس سے ایک افسانوی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔باوجود اس کے خاکہ نگار نے اپنے قلم کے جوہر بتاتے ہوئے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ خاکے پیش کیے ہیں۔جن میں خاکے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔بلاشبہ اپنے دور کے،اپنی زندگی کے اپنے ادبی میدان کے شہسواروں پر ابن کنول نے اپنے قلم و ذہن کا حق ادا کرتے ہوئے اگر خاکہ نگاری میں ایک اہم اضافہ کیا ہے تو یہ قابل ستائش ہے۔

□□□

Dr. Afreen Shabbar
Guest faculty
Department of Urdu
Mohanlal Sukhadia University
Udaipur-313001(Rajasthan)

اردو ادب میں چہار بیت کا تاریخی اور سماجی پس منظر

ڈاکٹر گلشن مسرت

چہار بیت کی ایجاد کا سہرا افغانستان کے سرحدی پٹھانوں کے سر باندھا جاتا ہے۔ پشتو میں چہار بیت کا آغاز اردو سے پہلے ہوا لیکن زمانہ وہی ہے جو اردو کا ہے۔ چہار بیت کو پٹھانوں کا لوک گیت بھی کہا جاتا ہے۔ اسے پٹھان راگ بھی کہتے ہیں۔ چہار بیت کا رہنما یا سربراہ کوئی استاد ہوتا ہے جس کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ فی البدیہہ شعر کہہ سکتا ہے۔ اگلے صف میں خلیفہ اور دائیں بائیں دو ایسے ہمنوا ہوتے ہیں جن کی آواز خلیفہ کی طرح اونچی اور حافظہ تیز ہو باقی لوگ دوسری اور تیسری صفوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تیسری صف والے کھڑے رہتے ہیں۔ دف نوازی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ سارے ہمنوا کسی ایک تال پر دف بجاتے ہیں۔ چہار بیت پٹھانوں کی بستیوں میں کافی مشہور ہے جیسے بھوپال، ٹونک، رام پور، قائم گنج، احمد آباد وغیرہ۔ چہار بیت میں غزلوں کے ذریعے رچی ہوئی معیاری زبان استعمال ہوتی ہے جو عوام تک پہنچتی ہے۔

کوئی بھی زبان اپنی ابتدائی شکل میں بولی کی صورت کوچہ و بازار میں عوام کے درمیان وجود میں آتی ہے اور خواص کی نظر التفات سے قبل عوام کے لاڈ پیار کے سائے میں گلی، کوچوں اور بازاروں میں پروان چڑھتی ہے۔ زبان اردو کا لوک ادب بھی ابتدا میں چھوٹے چھوٹے علاقوں میں ہی پروان چڑھا۔ اردو زبان میں لوک ادب کو عرصہ دراز تک قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اسے قابل توجہ اس لیے بھی نہیں سمجھا گیا کیونکہ اردو اپنی نفاست، لطافت اور نزاکت میں یکتائی کے سبب شہروں، درباروں، امرا اور روسا کی محفلوں میں حکومت کر رہی تھی اس لیے شہروں تک محدود تھی لوک ادب کو نا قابل توجہ جان کر ادب کے زمرے میں نہیں رکھا گیا اس کا سبب یہ بھی تھا کہ لوک ادب پر مقامی بولیوں کے اثرات بہت نمایاں تھے اس لیے یہ عوام میں اپنی فطری حیثیت اور روایت کی شکل میں پھلتا پھولتا رہا اور ایک عوامی روایت کی صورت آج بھی موجود ہے۔

لوک ادب کا تعلق زمینی سطح پر چھوٹے چھوٹے گاؤں قصبوں میں پروان چڑھنے والے ان نغموں قصّوں، کہانیوں سے ہے جو آہستہ آہستہ کسی مستحکم روایت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ لوک ادب شہر کی بھاگ دوڑ بھری مصنوعی زندگی کے مقابلے میں فطری احساسات اور جذبات کا آئینہ ہے جس میں زندگی اپنی پوری حقیقی صورت میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

ہندوستان قصّوں، کہانیوں کا ملک ہے جہاں کتنی ہی قدیم کہانیاں روایت کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ ہندوستانی آبادی کا ایک بہت بڑا حصّہ دیہاتوں میں زندگی بسر کرتا ہے دیہی ثقافت کی اس عظیم وراثت کو فراموش

نہیں کیا جاسکتا۔لوک ادب کو بھلے ہی دہقانی یا دیہی ادب مان کرادب کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا گیا ہومگراس کے عوامی رشتے کتنے گہرے اوراس کی تاریخی روایت کتنی مستحکم ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔لوک ادب کی کوئی باضابطہ تاریخ تو نہیں کیونکہ ابتدا میں یہ صرف زبانی روایت کی شکل میں فروغ پاتا رہا مگر یہ تاریخ اور روایت سینہ بہ سینہ اور بعض اوقات تاریخی بیاضوں کی صورت آج بھی موجوداور محفوظ ہے۔

لوک ادب میں پیش ہونے والا ادبی سرمایہ کسی نہ کسی صورت میں ماضی کی بازیافت بیان کرتا نظرآتا ہے۔لوک ادب کواسی تہذیبی وثقافتی اور تاریخی روایت کے ساتھ سنجویا اور سنبھالا جاتا ہے۔دیہی معاشر میں منعقدہ میلوں، شادیوں، تیوہاروں اور تقریبات میں اسے اسی فطری رنگ میں پسند کیا جاتا ہے اس لئے آج بھی یہ اپنی پرانی روش پر قائم ہے۔

لوک ادب کی شعری روایت کے مطالعے سے ہمیں اس کی مختلف اقسام کا پتہ چلتا ہے۔اس ضمن میں چہار بیت کا ذکر بہت اہم ہے۔اس کی ادبی روایت پیشاور سے لے کر ہندوستان کے ضلع ٹونک تک پھیلی ہوئی ہے اور اپنی مخصوص روایت کے ساتھ ہندوستان میں بھی عرصہ دراز سے محبوب ومقبولِ عام ہے۔

چہار بیت کا رواج ہندوستان میں کب سے ہے یہ قطعی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا لیکن چہار بیت کی صنف اردو میں فارسی شاعری کے توسط سے داخل نہیں ہوئی اور نہ فارسی شاعری میں اس فنِ شاعری کے متعلق کوئی تاریخی شواہد موجود ہیں نہ کوئی تفصیلات موجود ہیں۔

چہار بیت کے تاریخی ارتقاپر غور کریں تو یہی صورتحال اردو کی تصانیف میں بھی نظرآتی ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کی کوئی مکتوبی تاریخ موجودنہیں ہے۔

چہار بیت انیسویں صدی کی ابتدامیں روہیل کھنڈ کے اضلاع رامپور، سنبھل، مرادآباد، امروہہ میں رائج تھی اس کی تصدیق معتبر روایات اور قلمی بیاضوں سے ہوتی ہے۔

سرحدی قبائل کے باشندگان جب کسی تقریب میں شامل ہوتے ہیں تو غول درغول حلقے کی شکل اختیار کرکے اپنی زبان میں ہم آواز ہوکر گیت گاتے ہیں، مخصوص انداز میں دف بجاتے اور سپاہیانہ انداز میں رقص کرتے ہیں۔ چہار بیت کی روایت مخصوص فوجی نغمے کی صورت پشتو زبان سے اردوتک پہنچی، اردو میں چہار بیت کا فروغ فیض اللہ خان کے زمانے میں 1774 کے آس پاس ہوا جب افغانستان کے سرحدی علاقوں کے پشتو قبائل ریاست رام پور میں آباد ہوئے جب یہ قبائل ترک وطن کے بعد ہندوستان آئے اور روہیلکھنڈ اوراس کے اضلاع میں سکونت اختیار کی اس دور کی ملکی سیاسی صورتحال اور ذریعہ معاش کی خاطر فوجی ملازمت اختیار کی۔ یہ سپاہی دن بھر کی تھکاوٹ سے فرار حاصل کرنے کی غرض سے، فوجی چھاؤنیوں میں اس مردانہ رقص کو پیش کرتے جوان کے اندر جوش وخروش پیدا کردیتا اور ناظرین اس سے لطف اندوز ہوتے۔

ہندوستان کے مختلف قوموں اور قبائل کے اختلاط نے ان کے رہن سہن اور زبان کو متاثر کیا یا تو ان کے پشتو نغموں نے چہار بیت کی شکل اختیار کرلی اسی زمانے میں روہیلکھنڈ میں پٹھانی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا اور شمالی ہند میں اس عہد میں اردو شاعری اپنے عروج پر تھی ان پشتو نغموں نے بھی اردو کے دامن وسعت میں پناہ اختیار کی اور روہیلکھنڈ اس کا مرکز بنا۔چہار بیت کی روایت روہیل کھنڈ اوراس کے اضلاع کے علاوہ اس وقت تک ملک کے کسی حصے میں رائج نہ تھی جب یہ روہیلی سپاہی وسط ہند سے سفر کرکے راجستھان، بھوپال اور ٹونک تک پہنچے تو ان کے ساتھ چہار بیت کی روایت بھی ان ملکی حصّوں میں ان سپاہیوں کے ساتھ پہنچی۔

چہار بیت کے لفظی معنی چار شعر کے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ چہار بیت چار اشعار پر ہی مشتمل ہو، چہار بیت مثلث، مسدس، مثنوی اور متضاد کی ہئیت میں بھی لکھی جاتی ہے۔اس میں ہیئت اور موضوعات کا غیر معمولی تنوع موجود ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ مثلث، مسدس، مثنوی اور متضاد ہے تو موضوعاتی اعتبار سے اس میں عشقیہ، مذہبی، اخلاقی، تاریخی، قومی، سیاسی، سماجی اور تقریباتی موضوعات شامل ہوتے ہیں۔

ابتداً چہار بیت کو سپاہی الگ الگ گروہوں میں دف بجا کر گایا کرتے تھے جو نہ کسی ادبی معیار کے پابند تھے اور نہ کسی دبستان سے وابستہ۔ وہ اپنے فطری اور عامیانہ جذبات، جس میں اپنی جواں مردی کی ستائش، اپنے مقابل کی بزدلی کا اظہار، محبوب کی بے وفائی کا بیان اور محبوب بے وفا کی تضحیک وتمسخر اور توہین ان فوجی نغموں کے مخصوص موضوعات تھے جسے وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔اکثر وبیشتر یہ طنز وتضحیک، آپسی چشمک، رنجش اور خوں ریزی کی شکل ختیار کرلیتی تھی یہی سبب ہے کہ مہذب شعرانے چہار بیت کی ان محفلوں سے اجتناب برتا اور چہار بیت مہذب اور معیاری شاعری میں کوئی خاص مقام حاصل نہ کرسکی۔

چہار بیت کی جو ہیت آج رائج ہے اس میں ایک مطلع اوراس کی بحر میں تین مصرعے کہے جاتے ہیں جن کا قافیہ مطلع سے مختلف ہوتا ہے اور چوتھا مصرعہ مطلع کا ہم قافیہ ہوتا ہے اسی ہیئت پر چہار بیت کا ایک بند مکمل ہوتا ہے۔لیکن یہ شرط نہیں ہے کہ چہار بیت میں چار ہی بند ہو بلکہ بند کی

تعداد کم اور زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔

صنف چہار بیت فوجی نغمے کی صورت روہیلی سپاہیوں کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف خطوں کا سفر طے کر رہی تھی جہاں جہاں پشتو سپاہیوں نے سکونت اختیار کی ان کا پشتو نغمہ بھی ان کے ساتھ گیا۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا چرچا تھا تو یہ علاقے بھی اس کے اثر سے خالی نہ رہے اور ان فوجی نغموں میں بھی اردو زبان کی حلاوت گھل مل کر اسے مختلف تہذیبی رنگ میں پیش کرنے لگی اور ان نغموں کی آواز ان علاقوں میں سنائی دینے لگی جہاں جہاں یہ پشتو پٹھان اپنے ساتھ اس عوامی روایت کو لے گئے۔

رام پور، چاند پور، امروہہ، سنبھل، مراد آباد، مدھیہ پردیش، حیدرآباد اور راجستھان کے ٹونک ضلع میں چہار بیت کی صنف رائج ہوئی جو آج بھی قائم ہے تاہم اب تک اس کی شناخت صرف رزمیہ تھی، یہ سپاہی حلقوں میں تقسیم ہوتے، حلقے سے کوئی ایک فرد تان دیتا اور باقی ساتھی اس کو ہم آواز ہو کر دہراتے اس طرح وہ اپنی شجاعت اور دلیری کی داستانیں گاتے اور ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے اب تک چہار بیت میں ایک بے نیازی اور پھکڑ پن شامل تھا شاید یہی سبب تھا کہ اب تک اس کی رسائی بزم تک نہ ہو سکی تھی چہار بیت بزم کی رونق بخشنے کے سلسلے میں نواب محمد اسماعیل علی خان بہادر تاج کا نام سب سے نمایاں ہے۔ جن کی نظر التفات کے زیر اثر چہار بیت جیسی عوامی صنف میں بھی بلند آہنگی، رفعت و فکر اور قادر الکلامی جیسے رنگ شامل ہو گئے جس کے سبب دوسرے شعرا کی توجہ بھی اس طرف مبذول ہوئی، اور جلد ہی چہار بیت وسیع الخیال شعراء کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اب چہار بیت میں مقصدیت، معنویت، جدتِ بیان اور وسعت افکار بھی شامل ہو گئے جس نے اسے قدر و منزلت سے روشناس کیا۔

ان تبدیلیوں کا چہار بیت کی روایت پر خاطر خواہ اثر ہوا ان کے موضوعات میں جہاں تنوع شامل ہوا تو ان کی پیشکش کے طریقہ کار میں بھی مہذب طریق و اطوار در آئے اور آہستہ آہستہ چہار بیت رزم کی ہی نہیں بزم کی بھی زینت بن گئی۔ لیکن عوامی دلچسپی کے باعث پھکڑ پن کے عناصر اس میں شامل رہے شاید یہی وجہ رہی کہ دونوں دبستانِ فن نے اسے نہ ادبی سند عطا کی نہ دبستان دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ نے ادبی حیثیت سے اسے قبول کیا۔ مگر عوامی تقریبات میں ان محفلوں کا انعقاد رواج پا چکا تھا اور کثیر تعداد میں لوگ بلا تفریق مذہب و ملت ان محفلوں میں شرکت کرتے اور لطف اندوز ہوتے۔

یوں تو چہار بیت کی صنف ملک کے دوسرے حصوں میں رائج ہو چکی تھی مگر راجستھان کے ضلع ٹونک نے اس کی ترقی میں گراں قدر اضافہ کیا اور اسے مقبول خاص و عام بنایا۔ آہستہ آہستہ شرفا بھی ان محفلوں میں شرکت کرنے لگے اور چہار بیت کی صنف پر طبع آزمائی بھی کی لیکن ابتدا میں یہ شعرا چہار بیت اپنے نام سے منسوب کرنے سے گریز کرتے تھے۔

ریاست ٹونک قدیم راجپوتانہ کی واحد مسلم ریاست تھی حکومت برطانیہ اور نواب امیر الدولہ بہادر کے درمیان سیاسی معاہدے کی شکل وجود میں آئی۔ نواب خود سرحدی پٹھان تھے جن کے بزرگ ترک وطن کے بعد سنبھل، مراد آباد میں آباد ہوئے تھے۔ ان کی فوج میں بیشتر وہی پشتو قبائلی شامل تھے جو ترک وطن کر کے روہیلکھنڈ میں آباد ہوئے اور جب 1817 میں ریاست ٹونک کا قیام عمل میں آیا تو چہار بیت کا نغمہ بھی ٹونک میں رائج ہو گیا اور اردو کے ساتھ ساتھ چہار بیت کی صنف کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ نواب ابراہیم علی خان بہادر کے عہد حکومت میں صنف چہار بیت کی جانب خصوصی توجہ دی گئی اور مقامی شعرا کے علاوہ دہلی اور لکھنو کے شعرا نے بھی صنف چہار بیت پر توجہ مرکوز کی۔ 1930 سے 1948 تک کا زمانہ چہار بیت کے لیے بہت اہم ہے۔ اس عہد میں اسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

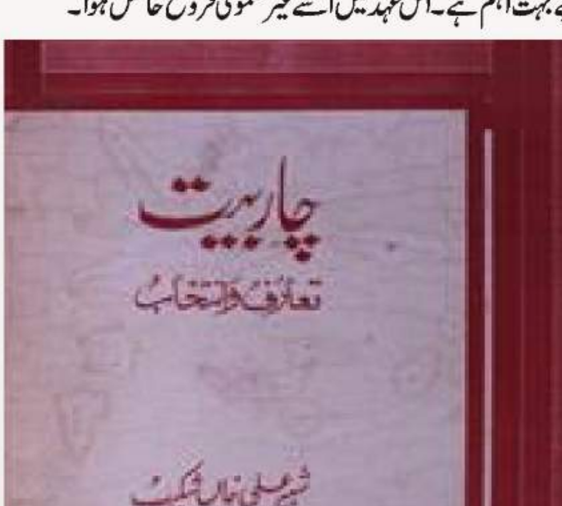

تشکیل راجستھان کے بعد پیدا شدہ سیاسی، معاشی تبدیلیوں کے سبب کچھ وقت کے لیے یہ صنف بھی تعطل کا شکار ہوئی مگر جلد ہی نئے جوش و

خروش کے ساتھ نئی پارٹیاں وجود میں آنے لگیں۔ اب چہار بیت کو شعرا نے جوش و خروش سے ہی نہیں ادبی اور عصری تقاضوں سے روشناس کرایا چہار بیت کی آواز گلیوں، بازاروں گھروں اور جلسوں اور تقریبات میں پھر سنائی دینے لگی۔

چہار بیت کو ملک کے کونے کونے تک پہنچانے میں جماعت ہند کے زیر اہتمام 1978 میں منعقد ہونے والا وہ جلسہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے جس نے ملک کے کونے کونے سے آنے والوں کو چہار بیت کی صنف سے نہ صرف متعارف کروایا بلکہ اسے ادبی حیثیت عطا کی اس کے بعد عالمی سطح پر منعقدہ ہندوستانی لوک ادب کے حوالے سے ہونے والے پروگراموں میں بھی راجستھان ٹونک کے چہار بیت فنکاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اور عالمی سطح پر چہار بیت کو ادبی شناخت بخشی۔ ٹونک کے شعرا نے چہار بیت کی روایت کو مزید استحکام بخشنے کی غرض سے اس کے موضوعات کے دائرے کو وسعت عطا کی جس میں رزمیہ، عشقیہ، سیاسی، رندی، قومی، وطنی موضوعات شامل تھے جنھوں نے چہار بیت کی فنی اور ادبی روایت کو فروغ دینے کا کارنامہ انجام دیا۔

1930 سے 1947 تک کا زمانہ نواب سعادت علی خان سعید کے دور حکومت میں چہار بیت کی روایت کے فروغ کا زمانہ تھا جس میں اختر شیرانی ، بسمل سعدی، صولت ٹونکی، عرشی اجمیری، اُفق اجمیری، امیر ٹونکی، ساحل ٹونکی، صائب ٹونکی، بصر ٹونکی، مولانا عبدالحیٔ فائز، دل ایوبی، بزمی ٹونکی، مراد سعدی، ناظر ٹونکی، چندن بھارتی، جام ٹونکی وغیرہ کے نام صنف چہار بیت کے حوالے سے معروف شعراء کی حیثیت سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء کی چہار بیت کے چند بند دیکھیں۔

چندن بھارتی کی چہار بیت کا ایک بند کچھ اس طرح ہے

مطلع

دل لگانا ہی پڑے گا مجھے معلوم نہ تھا
خاک اڑانا ہی پڑے گا مجھے معلوم نہ تھا

بند

بحر الفت کو میں سمجھا کہ ہے اک راہ گزر
تھی یہ امید کے بھرلوں گا میں دامن میں گہر
میں نے آغاز میں انجام پے ڈالی نہ نظر
ڈوب جانا ہی پڑے گا مجھے معلوم نہ تھا

چندن بھارتی کی ایک چہار بیت کا بند جس میں حب الوطنی کا اظہار ہے کچھ اس طرح ہے

مطلع

بڑی مشکل سے طوفاں غمِ حرماں سے نکلے ہیں
کہ ہم آزاد ہو کر خانہ زنداں سے نکلے ہیں

بند

وطن کو کس لیے سمجھیں نہ اب اہل وطن اپنا
گل اپنے شاخ تر اپنی بہار اپنی چمن اپنا
بگاڑے گا نئے بھارت میں کیا چرخ کہن اپنا
کہ ہم باعزم و ہمت گردشِ دوراں سے نکلے ہیں

مولانا عبدالحیٔ فائز کی چہار بیت کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

مطلع۔

دکھائی دیتا ہے یوں آفتاب شیشے میں
کہ جیسے تیرا رُخ پر عتاب شیشے میں

بند

وہ مست ناز وہ شوخی کا ایک حسیں پیکر
وقار حسن، سراپا شباب، رشک قمر
جب آئینے کے مقابل وہ آیا بن ٹھن کر
سمٹ کے آ گیا سارا شباب شیشے میں

ان شعرا کے علاوہ صنف چہار بیت کی مختلف لوگوں کا قیام عمل میں آیا جنھوں نے نہ صرف چہار بیت کے قدیم رنگ کو قائم رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا بلکہ اسے مذاق زمانہ سے ہم آہنگ کر کے اس کی ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ ان گروہوں میں شامل ہونے والے لوگوں کی تعداد تو متعین نہیں تاہم ان گروہوں میں عموماً 11 اور 13 افراد شامل ہوتے ہیں۔

یہ گروہ ملکی اور عالمی سطح پر وقتاً فوقتاً منعقدہ اجلاس میں شرکت کرتے ہیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں، شان ہند، شان ایمان، شان چمن، شان وطن، آفتاب ہند، تاج ہند وغیرہ کا شمار صنف چہار بیت کی مقبول پرفارمنس پارٹیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے درمیان باہمی مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ صنف چہار بیت کی بقاء اور ترقی میں ان کا بھی نمایاں کردار ہے۔

□□□

Dr. Gulshan Masarrat
347/161/16 Ka,
Old Tikait Ganj
LUCKNOW-26017(U.P)

عزہ معین

محبت کی مورت
اسّو پھوپو

ایک تھیں اسّو پھوپو۔ تھیں تو وہ میرے والد کی رشتے کی پھوپی لیکن ہم سب بچے بھی انھیں اسو پھوپھو بھی کہتے تھے۔ ویسے تو ان کے والدین نے ان کا نام عائشہ رکھا تھا لیکن اس نام سے بلانے والا کوئی اس دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ والدہ نے بھی ہمیشہ اسو ہی کہا اور رشتہ دار، پڑوسیوں نے بھی اسی لقب سے ان کی عزت افزائی کی۔ وہ وقت بھی ایسا کوئی خاص ناموں کو یاد رکھنے والا نہیں تھا۔ اکثر اوقات لوگ شادی کارڈ میں بھی گڈو، کلو، بھوری، منی، ببو وغیرہ ہی لکھواتے تھے۔ آدھار کارڈ کا نام ونشان نہیں ہوا کرتا تھا۔ فوٹو گرافی کی ممانعت ہوتی تھی ۔ حج پہ جانے کے لیے پاسپورٹ سائز فوٹو بنوانے کو جب سرکار نے لازمی قرار دے دیا تھا تو مولوی حضرات نے وہ لے دے کی تھی کہ بس اللہ کی پناہ۔ خواتین محلے میں اکٹھا ہو کر اس طرح باتیں کرتی تھیں کہ یہ سب اسرائیلی چالیں ہیں، دین سے پھیرنے کے طریقے رائج کئے جا رہے ہیں۔ بات اسو پھوپھو تک بھی پہنچی ۔ ان کی تان ہمیشہ اسی جملے پر ٹوٹتی تھی" بس قیامت قریب آ گئی اب۔ یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔"

ہوا یوں کہ شناختی کارڈ کے لیے دو دو فوٹو کھنچوانے تھے۔ بیسویں صدی کے آخری دس برسوں میں پہچان پتر کی مہم بہت زور وشور سے چلائی گئی تھی ۔سن پچانوے سے پہلے پہچان پتر بنے تھے ۔ اسو پھوپھو کسی صورت فوٹو گرافی کے لئے تیار نہیں تھیں۔ ان کا پارہ ساتویں آسمان پر کہ میں یہ گناہ اپنے سر نہیں رکھواؤں گی۔ قبر میں پاؤں دیئے بیٹھی ہوں۔ جانے کب بلاوا آ جائے ۔ مجھ سے یہ تصویر بنوانے کا کام نہ ہوگا۔ بیٹوں نے سمجھایا بہوؤں نے اپنی سی پوری کوشش کر کے دیکھ لی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ بلکہ گھر میں جتنے لوگ اپنے فوٹو جمع کر کے پہچان پتر بنوانے کو بھیج رہے تھے انھیں بھی خوب سمجھا رہی تھیں۔ مرد تو پھر بھی پردے کی آزادی سے بچ گئے لیکن عورتوں کو اسو پھوپھو نے دن رات سمجھایا۔ وہ کہتی تھیں غیر مردوں کے ہاتھ میں تمھاری تصویریں جائیں گی تو سوچو کتنی بے پردگی ہوگی اور اس خدا کے گھر کیا جواب دوگی۔ اسی کشمکش میں ایک سال گزر گیا۔ سب افراد خانہ کے آئی ڈی کارڈ بن کر آئے اور الیکشن میں ووٹ ڈالنے کے لیے ضروری قرار دیئے گئے ۔ ایک سال طویل عرصہ ہوتا ہے بالآخر اسو پھوپو نے بھی اپنے دل کو سمجھا ہی لیا اور بادل نخواستہ پہچان پتر بنوانے کے لیے راضی ہو گئیں۔ اب مرحلہ تھا انھیں رکشا سے فوٹو گرافی کی دوکان تک لے کر جانے کا۔ اس وقت پورے شہر سنبھل میں بس ایک ہی جگہ فوٹو گرافی کی دوکان کھلی تھی اس سے پہلے ضلع مراد آباد میں ہی فوٹو بنتے تھے۔ اتنا تصویر بنوانے کا رواج بھی نہیں تھا اور نہ ہی اتنے کاغذات میں تصویر لگا کرتی تھی ۔ بہر حال گھر سے ایک عورت کو ان کے ساتھ رکشہ میں سوار کیا گیا۔ برقع میں ملبوس دونوں خواتین تحصیل کے پاس بنی فوٹو گرافی کی دوکان پر پہنچیں۔ ان کے بڑے بیٹے اپنی سائیکل سے کچھ منٹ پہلے ہی دوکان پر پہنچ گئے تھے اور اپنی طرف سے فوٹو گرافر کو تفصیل سے سمجھا بھی دیا تھا۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ اگر بس میں لیڈیز سواریاں آتی تھیں تو لوگ

کھڑے ہو کر عورتوں کو بیٹھنے کی جگہ دیا کرتے تھے۔ دل سے عورتوں کی عزت ہوتی تھی ہم نے اپنے بچپن میں خوب دیکھا ہے۔ کنڈکٹر بس میں بیٹھے ہوئے نوجوانوں کو کھڑا کر دیا کرتا تھا اور سب خاموشی سے مان بھی لیا کرتے تھے۔ بات نکلتی ہے تو موضوع سے بھٹک جاتی ہوں۔ ہاں تو جب اسو پھوپھو کو ایک اسٹول دیا گیا کہ بیٹھ کر فوٹو کھنچوائیں۔ دو لائٹیں بڑی بڑی ان کے سامنے جلا دی گئیں۔ جس سے چہرے پر روشنی رہے۔ کیمرہ مین اپنے کیمرے پر پہنچ کر کہتا ہے" نقاب ہٹائیں" پہلے تو ہچکچائیں پھر چہرے سے سائیڈ کر کے ہونٹوں سے پکڑ لیا۔ اس نے کہا" کپڑا ہٹا دو اماں"۔ اسو پھوپھو کی لن ترانیاں شروع ہونے ہی والی تھیں کہ" اے میاں تصویر بنانی ہے تو ایسے ہی بناؤ۔" ان کے بیٹے نے بڑھ کر بات سنبھال لی۔" اماں جان یہ تصویر بنوانے کے لیے ضروری ہے کہ چہرہ مکمل طور پر واضح رہے نہیں تو تصویر کسی کام کی نہیں ہوتی ہے۔" مان گئیں اور نقاب کو الٹ کر جھکی ہوئی سی بیٹھ گئیں۔ اب بے چارہ کیمرہ مین ان سے کہے اماں ذرا سامنے دیکھو، ذرا سیدھا بیٹھو۔ وہ تو شکر تھا کہ ساتھ میں گھر کے دو افراد تھے تو بات بن گئی مگر واپسی میں راستے بھر استغفار اور کیمرہ مین کی برائیاں کرتی ہوئی آئیں۔ انھیں لگا کتنا بے شرم آدمی تھا۔

اسو پھوپھو کا پہچان پتر بھی ساٹھ بہاریں دیکھنے کے بعد ہی بنوایا گیا تھا۔ پچاس کی عمر میں دانت نام کی شئے سے منھ خالی ہو گیا تھا۔ بینائی بھی کمزور تھی۔ چلنے پھرنے میں بھی پریشانی کا سامنا رہتا تھا۔ لیکن آخر وقت تک کمر میں جھکاؤ پیدا نہیں ہونے پایا تھا۔ جانے کیا حوصلہ کیسی محبت تھی کہ اتنی ضعیفی کے باوجود بھی سب کے گھروں میں گھوم ہی آتی تھیں۔ ڈیڑھ دو مہینہ اوپر نہیں گیا کہ حاضر ہو جاتی تھیں۔ جب گھر سے نکلتی تھیں تو پورا پورا دن واپس نہیں آتی تھیں بلکہ سب جاننے والوں کے گھروں میں گھومتی رہتی تھیں۔ گھر میں کوئی ذمہ داری بچی نہیں تھی شوہر مسجد میں موذن تھے جوانی کی دہلیز پار کرتے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاید بڑھاپے کی پریشانیوں کو ساتھ میں جھیلتے مگر اللہ کی مرضی۔ ایک مرتبہ دوپہر کے وقت گھر میں داخل ہونے کے ساتھ ہی بیگم کو کسی کام کے لیے آواز دی۔ بیگم کوٹھڑی میں مٹی کی بنی اناج کی کٹیا کو صاف کر رہی تھیں۔ اندر سے کہہ دیا میں یہاں ہوں (پرانے وقتوں میں مٹی کے بنے بہت سے سامان میں ایک اناج کی کٹھیا بھی ہوا کرتی تھی۔ کھیتوں سے آنے والے گیہوں دھان وغیرہ اس میں بند کر کے رکھ دیئے جاتے تھے اس کی پیمائش کمرے کی برابر ہی ہوتی تھی اور اس کو عورتیں کمروں میں ہی بنایا کرتی تھیں۔ تالابوں کے تل سے نکلی ہوئی کالی اور چکنی مٹی سے بنی یہ کٹھیا بہت کام کی ہوتی تھی۔ ہاں تو اسّو پھوپھو کے میاں اپنی ہی فکر میں کمرے میں پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ چھوٹی سی کھڑکی نما دروازے سے دھول میں اٹا ہوا چہرہ، موٹے موٹے لینس والا چشمہ، گھنگرالے کھڑے بالوں میں سانولا چہرہ ہے۔ اچانک میں ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور گھبراہٹ میں بھوت بھوت چلاتے ہوئے باہر کو بھاگے۔ اندر سے اسّو پھوپھو کی کراری آواز سنائی دی۔" اے کیا بھوت بھوت چلا رہے ہو۔ چڑیل سر پہ سوار ہو گئی ہے کیا۔" اس کے بعد بہت دن تک یہ واقعہ سب کو سنا کر ہنستی رہیں۔

ان کے بیٹے اور بہو بہت کم عمر میں گزر گئے تھے۔ اپنے دس پوتے اور پوتیوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ رشتے داروں میں اس طرح گھومتی تھیں کہ ایک گھر سے نکلتی تھیں تو کسی بچے کو ہاتھ پکڑ کر کہتی تھیں ذرا کلثوم کے گھر تک" لکھا" دیئے (پہنچا دے) یا فلاں ابن فلاں جانے کتنی پہچان والیاں تھیں جانے کتنے رشتے دار لیکن مجال ہے جو راستے میں پڑتا ہوا کوئی گھر چھوڑ دیا ہو۔ بچے ان کے ساتھ چلنے میں بہت کڑھتے تھے ایک تو گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو پکڑ لینا پھر یہ نہیں کہ جلدی جلدی چھوڑ کر بچے جان چھڑا لیں بلکہ نہایت آرام سے آہستہ آہستہ چلا کرتی تھیں اور پھر راستے کی نالیوں، گزرنے والی سائیکلوں یہاں تک کہ لوگوں سے بھی بچانے کی ذمہ داری نبھانے میں ساتھ لے جانے والے بچے کی حالت خراب ہو جاتی تھی۔ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسی لیے ان کے ساتھ والے فرد کو زیادہ مشکل پیش آتی تھی۔ سنیے کہ وہ محبت بھری باتیں کیا ہوتی تھیں جو وہ گھروں میں بیٹھ کر کیا کرتی تھیں۔ وہ جب کسی کے گھر آتی تھیں بلکہ ہمارے ہی گھر کا احوال ملاحظہ کیجیے۔ میں تیسرے یا دوسرے درجے کی طالبہ رہی ہوں گی۔

اسو پھوپھو ہمیشہ دروازے سے ہی بولنا شروع کر دیتی تھیں۔ آواز سن کر ان کی آمد کی خبر ہو جاتی تھی۔ اندر آنا تو دور سیڑھیوں پہ چڑھنے سے پہلے ہی (دروازے پر تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں) کہنا شروع کر دیتی تھیں کہ" ارے منے، ارے ٹھیک ہے (میرے والد صاحب کو منے ہی کہا کرتی تھیں)" اونھ اتی اونچی چوکھٹ رکھی اے ہے چڑھا بھی نہ جا ریا۔ اے پہلے لوگ ریوے نا تھے ابی برسات گھروں میں گھسے گی پکے مکان کروا لیے مگر پانی کا ڈر نہ نکلا اس نسل کا۔" (اتنی اونچی چوکھٹ رکھی ہے پڑھنا ان کے لیے مشکل امر تھا۔ کہتی تھیں کہ پہلے زمانے میں لوگ رہتے نہیں تھے کیا۔ ابھی برسات کا پانی گھروں میں آئے گا کہ سب اونچی دہلیز بناتے ہیں) اندر آ کر بیٹھ جاتیں اور پانی پینے کو مانگا کرتی تھیں۔ اکثر پانی کا گلاس دینے کے لیے میں ہی موجود ہوتی تھی۔ بس گلاس ہاتھ میں اٹھایا

اور شروع ہو جاتی تھیں۔" اے بہو اب پھکر پڑ جاوے گی منی (جتنی بھی خاندان میں لڑکیاں تھیں سب کو منی ہی کہا کرتی تھیں۔ انھیں سب کی فکر تھی) بڑی ہو گئی۔ بیاہ کے لیے سامان جوڑ لے"۔ میرے ذہن میں خیال آتا کہ یہ کیا بات ہوئی ابھی تو ہم اتنے چھوٹے ہیں اتنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ اور یہ جملہ سنتے سنتے 'بی اے' مکمل ہو گیا بس پھر ان کے الفاظ میں یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ اب جب بھی ہانپتی کانپتی آتیں تو پہلا سوال ہوتا " اے بہو منیا کا کہیں رشتہ لگا دیا یا نہ" مجھے ان کا منیا کہنا بہت برا لگتا تھا۔ یہ بعد میں سمجھ آیا کہ ان کی زبان میں رچا بسا جملہ تھا۔

ہم خاندان کی لڑکیاں کہتی تھیں ان سے سب کی شادیاں کروالو ہاں بس ۔ شادی بیاہ والے گھروں میں آٹھ دس دن کے لیے ڈیرہ جما لیتی تھیں۔ ہر کام میں ان کے مشورے شامل ہوتے تھے۔ برات کے انتظامات، سسرال والوں کی خاطر مدارات، جہیز کے کپڑوں میں جانے والی اشیاء الغرض ہر چیز میں ان کی مداخلت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی گراں بھی گزرتی تھی۔ شادی والے دن پورا گھر میرج ہال جاتا تھا تو اسو پھوپھو گھر پہ رک جاتی تھیں دیکھ بھال بھی رہتی تھی اور آنے والے مہمانوں کو بھی کمپنی دیتی تھیں۔

وقت گزرتا رہا ایک ایک کر کے سب کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ اور ایک دن سب کی فکر کرنے والی اسو پھوپھو بھی خاموشی سے گزر گئیں جب تھیں تو ان کا ٹوکنا سب کو برا لگتا تھا اب نہیں ہیں تو ہر محفل میں ان کو یاد کیا جاتا ہے۔

□□□

Izza Moin
D/o Abdul Moin
Hindu pura saman Shaheed
Sambhal-244302 (U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :A/C، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: E-mail:magazines@ncpul.in, 011-26108159

دستخط

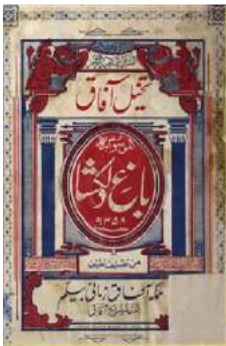

رانی حفیظ

دبستان لکھنؤ کی چند ممتاز مرثیہ نگار خواتین

یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں خواتین نے اپنی بھرپور نمائندگی درج کی ہے لیکن ادب سے ان کی دلچسپی شروعات سے ہی بہت زیادہ رہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اردو ادب کا جو ابتدائی سرمایہ ہے اس میں خواتین بطور مصنفہ اور شاعرہ نظر نہیں آئیں ہیں لیکن بطور سرپرست ان کی خدمات قابلِ ذکر رہی ہیں۔ اردو میں ترقی پسند تحریک نے خواتین کو ایک نیا پلیٹ فارم عطا کیا ہے۔ 1936 میں لکھنؤ میں ترقی پسند تحریک کے پہلے جلسے میں بطور صدر منشی پریم چند نے جو خطبہ دیا اس نے اردو ادب کے ''حسن کے معیار بدلنے'' کا جو تاریخی جملہ کہا اس نے خواتین کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ خواتین نے دیگر شعبہ جات کی طرح اردو ادب میں بھی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے خواتین معاشرے کا ایک لازمی اور اہم حصہ ہیں اردو شاعری ہو یا دنیا کی دوسری زبانوں کی شاعری اس میں خواتین کا حصّہ بہت کم ہے لیکن ہندوستان میں بالغ نظر شاعرات کی کمی نہیں ہے اردو شاعری میں اودھ کی شاعرات کا بڑا نام ہے اور ان شاعرات کے نام اودھ کی تاریخ میں ملتے ہیں۔ اردو ادب کی ابتداء میں خواتین شاعرات کا بڑا ذخیرہ ہے اس کی تخلیق میں خواتین نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس پر اکثر گفتگو ہوئی ہے اور مضامین اور مقالے بھی لکھے گئے ہیں کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں اردو ادب کی تاریخ میں ہر دور میں خواتین کی حصے داری رہی ہے۔

ہر سال 8 مارچ کو عالمی یوم خواتین بین الاقوامی سطح پر منایا جاتا ہے اس کا مقصد دنیا کو خواتین کی اہمیت سے آگاہ کرانا ہے 1911 میں پہلا عالمی یومِ خواتین منایا گیا۔ بیسویں صدی کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اردو مرثیہ نگاری میں خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے، باقاعدہ طور پر بیسویں صدی کے آغاز سے ہی خواتین میں یہ جذبہ دیکھنے کو ملا یہ دور خواتین کا پہلا دور تھا اس دور کی شروعات میں مرثیہ نگاری پر بہت کام ہوئے ہیں جن میں سے چند لکھنؤ کی مشہور خواتین مرثیہ نگاروں کے بارے میں مختصر گفتگو آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔

1۔ ملکہ زمانی:۔ ان کا پورا نام ملکہ آفاق زمانی بیگم تھا ملکہ زمانی بیگم ریاست اودھ کی ملکہ، اور نواب اودھ نصیر الدین حیدر شاہ کی زوجہ تھیں۔ ان کی پیدائش انیسویں صدی کی نویں دہائی میں ہوئی ان کے والد کا نام صابر علی خان صابر تھا یہ ایک صاحب دیوان شاعر اور ریاست ٹونک سے تعلق رکھتے تھے رام پور کے نواب لوگوں سے قریبی تعلق تھا۔ ملکہ آفاق نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ ذاتی شوق سے اردو فارسی پر کامل دسترس حاصل کی ان کی بہن بھی شاعرہ تھیں ملکہ زمانی سید ظفر حسین منتظر امروہوی کی شاگردہ بنیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''باغ دلکشا'' 1940 میں شائع ہوا

جب ان کا مجموعہ شائع ہوا تو سنبھل میں تھیں اور کافی لمبی عمر پائی ان کا انتقال 1983 میں ہوا۔ان کی کتاب باغ دلکشا سے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

کیوں نہ ہو مطلع سے ساطع نور مہر و ماہ کا
صفحۂ قرطاس پر طغرا ہے بسم اللہ کا
طالبِ منصب نہ ہے وارفتہ عزّ و جاہ کا
بے نیاز خلق ہے جو تیری در گاہ کا
راہِ وحدت عشق میں بھی ہاتھ سے جاتی نہیں
خط کی پیشانی پہ لکھے ہیں الف اللہ کا

2۔سلطان عالیہ:۔ ان کا نام سلطان عالیہ عثمانی تھا یہ ایک عثمانی شہزادی تھی ان کی پیدائش 24 اگست 1880 کو چراغاں محل میں ہوئی ان کے والد سلطان مراد خامس پنجم جو عبد المجید اول اور شیو کفذا قادین کے بیٹے تھے ان کی ماں کا نام ریسان ہانم تھا۔سلطان عالیہ سلام اور مرثیہ کہتی تھیں اور اپنی مادر گرامی کی طرح مرزا دبیر کی شاگرد تھیں ان کے پانچ سلام مخطوطات زاہد سہارنپوری سے دستیاب ہوئے ہیں ان کے ایک سلام ''زہے جمال حسین وخوشالقائے حسین'' کے تین اشعار پر مرزا دبیر کی نظمیں سامنے آئی ہیں شاگرد کے کلام پر استاد کی نظمیں ایک نرالی بات ہے ان کا انتقال 19 دسمبر 1903 کو 23 سال کی عمر میں ہوا ان کو کپوڈن پاشا محمد علی پاشا کے مقبرے میں دفن کیا گیا جو ایوب قبرستان استنبول میں واقع ہے۔

نمونہ کلام:

حیاتِ حضرت شبیر ہے لقائے حسین
کوئی بزرگ نہ سر پر تھا اب سوائے حسین
حسین روئے تھے خود کہہ کے ہائے ہائے حسین
فغان و آہ کرا ے مجرئی برائے حسین
نہیں حسین کے ماتم سے کم عزائے حسین

3۔تاجدار لکھنوی:۔ تاجدار لکھنوی لکھنؤ کی مشہور مرثیہ گو شاعرہ تھیں ان کو تاجدار بہو بھی کہا جاتا تھا ان کا ایک مرثیہ ''کتب خانے'' محمود آباد میں محفوظ ہے اور ان کا پورا مرثیہ کہیں نقل نہیں ہوا ہے صرف ایک بند نقل کیا گیا ہے تاجدار بہو نے اس بند میں حضرت امام حسین اور حضرت عباس کے ساتھ ہونے کو حضرت حمزہ اور حضرت علی کے ساتھ ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

نمونہ کلام:

یہ جنگ بھی جہاں کے لیے یادگار ہے
یہ معرکہ بھی قدرت پروردگار ہے
حمزہ کی اور علی کی بہم کا راز ہے
فوج عدد میں رعب سے اب انتشار ہے

4۔حزیں نیوتنوی:۔ ان کی پیدائش 1909 میں بمقام کانپور میں ہوئی ان کو ثم لکھنوی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ان کے والد کا نام حکیم سید اصغر حسین تھا ان کی شادی ایک ممتاز ادیب محقق سید مسعود حسین رضوی ادیب سے ہوئی۔شوہر کی زندگی میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی تحقیق میں بھی شریک رہیں خود ایک اچھی شاعرہ اور محقق تھیں اور انھوں نے ''اردو امثال'' پر بھی تحقیقی کام کیا۔

نمونہ کے طور پر چار مصرعے میسر آئے ہیں:

جانبِ میدان ہمکتے تھے جو اصغر بار بار
ماں لگاتی تھی سینے سے تڑپ کر بار بار
اک غم شہ کے سوا دنیا میں کوئی غم نہ ہو
یہ حزیں تجھ سے دعا کرتی ہے داور بار بار

5۔گوہر آرا بیگم لکھنوی:۔ ان کا پورا نام گوہر آرا بیگم تھا اور تخلص گوہر تھا ان کی پیدائش 17 جون 1631 کو برہانپور میں ہوئی ۔یہ ایک مغل شہزادی تھیں ۔ان کے والد مغل سلطنت کے مشہور بادشاہ شاہ جہاں تھے۔ان کی والدہ کا نام ممتاز محل تھا۔ممتاز محقق ڈاکٹر اکبر حیدری کی رائے میں میر خلیق، میاں دلگیر اور میر ضمیر وغیرہ کی ہم عصر شاعرہ تھیں ۔ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے ان کا ایک مرثیہ دریافت کیا ہے جو بہت ہی شیریں سادہ اور شگفتہ زبان میں ہے۔ یہ مرثیہ مہاراج کمار مرحوم والی محمود آباد کے کتب خانہ محمود آباد ہاؤس لکھنؤ میں محفوظ ہے ان کا انتقال 1706 میں ہوا۔

مذکورہ بالا مرثیہ گو شاعرات کے علاوہ بھی لکھنؤ کی سرزمین پر بے شمار خواتین ہوئیں ہیں جنھوں نے اس فن کو وسعت و ترقی بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن طوالت کے خوف سے انھیں قلم انداز کیا جاتا ہے۔

نمونہ کلام:

برباد الٰہی نہ کوئی پردہ نشیں ہو
بے مقصد و چادر نہ کوئی زار و حزیں ہو
پردیس میں ویراں نہ کوئی صاحب دیں ہو
تر خونِ برادر سے کسی کی نہ جبیں ہو
زینب سی جو آوارہ وطن ہو وہی جانے
بازو میں بندھی جس کے رسن ہو وہی جانے

6۔ دیوروپ کماری ۔بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جدید

مرثیہ کے حوالے سے خواتین مرثیہ نگاروں میں ایک نام دیوروپ کماری کا آتا ہے دیوروپ کماری پہلی اور واحد غیر مسلم خاتون مرثیہ گو شاعرہ کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں ان کی پیدائش آگرہ میں ہوئی ان کا تعلق کشمیری پنڈت گھرانے سے تھا۔ گھر اور سماج کا ماحول بھگتی شاعری سے لبریز تھا اردو فارسی اور انگریزی زبان پر مہارت حاصل تھی۔ فارسی زبان سے انھوں نے منشی کامل کا امتحان بھی پاس کیا اور انگریزی زبان پر کامل دسترس حاصل کی۔ ان کا پہلا مرثیہ ''بادہ عرفان'' 1932 میں تصنیف ہوا اور یہ مرثیہ اتنا مقبول ہوا کہ کچھ سالوں میں پانچ مرتبہ شائع ہوا۔ ان کے استاد حضرت فضل رسول تھے اور دیوی روپ کماری کے کلام پر چھاپ کی وجہ یہ ہے کہ ان کے استاد انیس کی فرد میر انس کے شاگرد تھے۔

نمونہ کلام:

صنعت صانع قدرت کا بیان مشکل ہے
راز قدرت کرے انسان عیاں مشکل ہے
کس طرح پہنچے وہاں وہم و گمان مشکل ہے
جب تلک ہو پیمبر کی زبان مشکل ہے
مجھ سے اس وقت بیاں ہو سکے اس کی توحید
با خدا یا کہ ہو، ہم نام خدا کی تائید

7۔ امت الحمدی شہرت۔ ان کا نام امتہ الحمدی، تخلص شہرت تھا۔ ان کا وطن حیدر آباد (دکن) مرزا شہر کی پوتی تھیں۔ مرزا علی بادر کی صاحبزادی اور رفیہ بیگم ریاضت کی چچازاد بہن ہیں۔ انھوں نے تہذیب اور حیا کی چار دیواری میں رہ کر مرثیہ کہنا شروع کیا خواتین کی مجالس میں بھی مرثیہ پڑھتی رہیں۔ وفات کے کئی برس بعد پہلی بار ان کا مرثیہ شائع ہوا اس کے بعد سے ہی لوگ ان کے نام کو جاننے لگے تھے کچھ عرصے بعد ان کے تین اور مرثیے دستیاب ہوئے ان کے آٹھ مرثیوں کا مجموعہ 1990 میں باب العلم سوسائٹی حیدر آباد کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ ان کے مرثیوں کو لوگوں نے خوب پسند کیا۔ ان کے مراثی میں مدح اور مصائب پر زور دیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود مرثیہ کی روایت اور لفظیات کا انھیں پورا ادراک تھا اس کے تحت ان کے مرثیے کہیں دعا، کہیں مدح، کہیں گریہ تھے۔ نمونہ کلام:۔

شیعوں کی جان تجھ پہ ہو قربان یا علی
اسلام جسم اور تو ہے جان یا علی
تیری ولا کا نام ہے ایمان یا علی
واللہ تو ہے مفتی قرآن یا علی
تو عالمِ علوم خدائے علیم ہے
تو جانشیں خاص رسولِ کریم ہے

ان کے مرثیوں کو سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سامنے بیٹھ کر مرثیہ سن رہے ہو۔ اس کی وجہ ان کی پردہ داری تہذیبی ماحول تھا شہرت کے مراثی کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں:

1۔ پنج مراثی (پانچ مرثیوں کا مجموعہ)
2۔ ہشت مراثی (آٹھ مرثیوں کا مجموعہ)

8۔ گل فروا امروہوی:۔ ان کی پیدائش 1971 میں لاہور میں ہوئی ان کا وطن مالوف امروہہ ہے لیکن ہندوستان تقسیم ہونے کے بعد ان کے والد ہجرت کر کے پاکستان آگئے انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم پاکستان میں ہی حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے 1992 میں انھوں نے اسلامک اسٹڈیز میں ایم۔ اے کیا انھوں نے 19 برس کی عمر میں 1990 میں پہلا مرثیہ کہا انھیں شعر کہنے کا شوق تھا بچپن سے ہی انھوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا 16 برس کی عمر میں ان کی نظمیں سامنے آنی شروع ہو گئیں۔ اتنی کم عمر میں انھوں نے مرثیہ کہے جو لوگوں کو بہت پسند آئے۔ مرثیہ گوئی کے لیے شعر گوئی پر اور تاریخ پر کامل دسترس ضروری ہے تب جا کر کہیں مرثیہ کہا جا سکتا ہے انھوں نے جو پہلا مرثیہ کہا اسے مرثیہ تسلیم کیا گیا ہے ان کے مرثیے کے کچھ بند درج ذیل ہیں:

گل فروا کے پہلے مرثیہ کا عنوان ''تصویر وفا'' ہے۔

گلزار مصطفیٰ میں ہے ہر سو نئی مہک
ہر برگ گل پکارتی ہے یہ لہک لہک
آمد چمن میں آج نئی اک کلی کی ہے
شامل فضا میں سارے پرندوں کی ہے چہک
گھر میں علی کے خلد بریں کی جو ہے بہار
اک عید ہے ولادت عباس نا مدار

9۔ سلطانہ ذاکر ادا:۔ ان کی پیدائش 1 ستمبر 1929 میں رامپور (یوپی) میں ہوئی، ان کا نام مصطفیٰ سلطانہ اور تخلص ادا تھا اور قلمی نام سلطانہ ذاکر ادا۔

والد کا نام خورشید علی مرزا تقی کاظمی تھا سلطانہ کی شادی 16 مئی 1944 میں امروہہ کے نقوی خاندان میں کر دی گئی تھی۔ شوہر کا نام سید ذاکر حسین نقوی تھا وہ نواب رام پور کی فوج میں افسر تھے انھوں نے شاعری کی ابتدا 17 برس کی عمر میں کی انھوں نے اپنی کتاب ''سفر کب تک'' میں

خود اس بارے میں بتایا ہے۔ ان کے مرثیہ کی ابتدا 1994 میں ''السوبرانتے'' کیلیفورنیا (امریکہ) میں ہوئی 1936 سے 1994 تک سلطانہ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ان کا کلام ''نمودِ سحر'' میں شائع ہوا ہے جسے ''جاوداں'' کراچی نے 1999 میں شائع کیا تھا ان کا پہلا مجموعہ کلام ''معراج وفا'' ہے جو 1996 میں شائع ہوا اس کتاب میں سب سے پہلی مناجات کا سنہ تخلیق 1969 پہلی نعت 1973 اور پہلا مرثیہ 1994 درج ہے۔ سلطانہ ذاکر ادا کی تصانیف کی ترتیب وتعداد حسب ذیل ہے۔

1) ''معراج وفا'' حمد نعت، منقبت، سلام۔مرثیہ مطبوعہ 1996

2) ''نمودِ سحر'' غزلیات، منظومات 1999

3) ''سفر کب تک'' نثر کی کتاب

سلطانہ ذاکر ادا کی مرثیہ گوئی نہ میر انیس کی مرثیہ گوئی ہے نہ ہی جمیل مظہری، نہ آلِ رضا کی شاعری ہے لیکن ان کی مرثیہ گوئی فنی نشیب و فراز سے درگزر سلطانہ ذاکر ادا کی مرثیہ گوئی ہے اور ان کے مرثیہ میں محبت عقیدت نمایاں ہے۔ان کے پہلے مرثیے کا آغاز کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے درود مسعود سے ہوتا ہے۔

وارد جو کربلا میں شہ کربلا ہوئے
اور جمع گردِ شاہ سبھی باوفا ہوئے
نزدِ فرات خیمے حرم کے بپا ہوئے
اہلِ ستم بھی جمع برائے جفا ہوئے
اکبر ہیں جو پھوپھی کی عماری کو لائے ہیں
عباس بھی جلوسواری کے آئے ہیں

10:۔بانو نقوی:۔ان کی پیدائش 1933 بمقام جگراؤں ضلع لدھیانہ میں ہوئی ان کا نام شہر بانو، قلمی نام سادات نقوی۔ولد گرامی سید محمد عسکری نقوی تھا۔انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی کیوں کہ ان کے والد گرامی سید محمد عسکری نے گھر میں علمی ماحول رکھا اور ساری زندگی علوم محمد کی ترویج میں مصروف رہے۔ان کی والدہ جناب شریف العماء کی پوتی ہیں انھیں میر انیس کے بہت سے مرثیے یاد ہیں شہر بانو نقوی نے دس برس کی عمر میں 1945 میں ایک نوحہ کہا۔لوگوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور شہر بانو کے لیے شعر و ادب کے دروازے کھل گئے۔شہر بانو درس گاہِ کربلا کی طالبہ علم شہر بانو کے ذہن میں ظلم اور مظلومیت کے خطوط واضح ہو گئے۔کربلا نے شہر بانو کو نفرتوں کی آندھیوں میں محبت کے چراغ جلانے کا سلیقہ دیا۔انھوں نے جب اپنا پہلا مرثیہ کہا تب یہ سلیقہ ابھر کر سامنے آیا۔شہر

بانو کا یہ مرثیہ 62 بندوں پر مشتمل ہے۔اس مرثیے کا عنوان ''ماہ بنی ہاشم'' تھا اور اس کی ابتدا ''محبت'' کے بیان سے شروع ہوئی:

خالق نے عجب چیز بنائی ہے محبت
انسان کو فطرت نے سکھائی ہے محبت
یوں روح میں ہر شے کی سمائی ہے محبت
ہر عضو و بدن اتر آتی ہے محبت
تصدیق بھی ہو جاتی ہے لولاک لما سے
ہے رابطہ بندے کا اسی طور خدا سے

مذکورہ بالا مرثیہ گو شاعرات کے علاوہ بھی لکھنؤ کی سرزمین پر بے شمار خواتین رہی ہیں جنھوں نے اس فن کو وسعت و ترقی بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن طوالت کے خوف سے انھیں قلم انداز کیا جاتا ہے۔

□□□

Rani Hafeez
Research Scholar
Arabic & Persian Department
University of Allahabad
Prayagraj-211002 (U.P)
Mobile No.: 9628947998

الطاف احمد میر

لکھنؤ کی چند اہم شاعرات

دبستانِ لکھنؤ اپنی پہچان کے اعتبار سے جدا حیثیت کا حامل ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی موت کے بعد دلی کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا جس کا اثر یہاں کے سیاسی، اقتصادی اور معاشی حالات کے ساتھ ساتھ شعر و ادب پر بھی پڑا اور بارہ سال میں آٹھ بادشاہ تخت نشین ہوئے جن میں آخری بادشاہ محمد شاہ تھے۔ لکھنؤ محمد شاہ بادشاہ کے عہد تک سلطنت دلی کا ایک حصہ ہی تھا۔ نادر شاہ نے 1738 میں دلی پر حملہ کر کے قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا جس کے نتیجہ میں شعرا اور ادبا نے یہاں سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں پناہ لی۔ اس طرح دلی کے سیاسی انتشار کے بعد دبستانِ لکھنؤ کی ساخت کا اہتمام ہو گیا تھا اور یوں اودھ کے سیاسی حالات اور معاشی خوشحالی نے علاقہ کی معاشرت اور ثقافت پر اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیے۔

دبستانِ لکھنؤ کے شعرا کی خصوصیات قدیم اور کلاسیکی شاعری سے جدا ہیں۔ لکھنؤ کا معاشرہ تصنع، بناوٹ اور ظاہری چمک دمک سے عبارت تھا۔ یہاں محبوب کی دلی کیفیات اور حسن و عشق کے جذبات اور محسوسات پر توجہ نہیں دی گئی بلکہ محبوب کے اعضائے بدن اور اس کی ظاہری چمک دمک کو موضوع بنایا گیا۔ اس دور میں طوائفوں اور پیشہ ور عورتوں کی وجہ سے حسن اور حسن کے جلوے عام تھے۔ کوٹھوں پر جانے اور بازارِ حسن تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ خود بادشاہ عیش پسند تھے۔ نازنینوں کے جمگھٹے ان کے ساتھ رہتے تھے اور شرم و حیا کا سماج میں کوئی کردار نہیں رہا تھا۔ شاعر بھی محض ظاہری اور خارجی جلوؤں کو منظوم کر دیتے تھے۔ جذبات و احساسات سے عاری یہ کلام محض لب و رخسار، دہن، چال، ڈھال، انداز و ادا اور وصال کے سستے بیانات تک محدود تھا۔ لکھنؤ کے زوال آمادہ معاشرہ میں ہوس پرستی عام تھی۔ گانے والیوں اور بازاری عورتوں کی بہتات تھی۔ چونکہ اخلاقی اقدار کا بھی ایسا پاس و لحاظ نہیں تھا اس لیے جو بات بھی کی جاتی کسی پاس و لحاظ کے بغیر اور جو کام بھی کیا جاتا اعلانیہ، جذبات و احساسات کی پاکیزگی اور اظہار کی سنجیدگی اور بردباری کا کہیں پر پتہ نہیں تھا۔ لہجہ بھی عامیانہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اعتبار سے معاملہ بندی کو فروغ ہوا۔ لکھنؤ کے دبستان میں معاملہ بندی نے عجیب و غریب صورت اختیار کر لی اور حد تو یہ ہے کہ جرأت جیسے شاعر کو جس کی پرورش و پرداخت دہلی میں ہوئی، معاملہ بندی میں بامِ عروج تک رسائی حاصل کی اور رکیک جذبات کا اظہار غیر مہذب پیرایہ میں کیا۔ اس کے علاوہ ناسخ

کے ہاں بھی معاملہ بندی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ آتش نے بھی معاملہ بندی سے کام لیا لیکن ناسخ سے کم۔ انیس، دبیر اور نسیم وغیرہ نے دبستانِ لکھنؤ سے تعلق رکھنے کے باوجود فصیح، سلیس، شستہ اور معنی خیز تشبیہات ،استعارات اور دوسرے شعری وسائل سے کام لیا لیکن لکھنؤ کے عام شاعروں کے یہاں تشبیہات، گنجلک رکیک اور زیادہ تر جنسیات لیے ہوئے ملتی ہیں۔ عورت اپنے ابتدائی زمانے میں ہی زندگی کے معمول میں شریک رہی ہے اور اپنے دکھ درد کے احساس میں اس کو اپنی فکر بھی ہونے لگی کہ اس کی بھی اپنی پہچان ہونی چاہیے تا کہ وہ مردوں کی بنائی ہوئی شخصیت کا کہیں عکس بن کر نہ رہ جائیں اردو ادب میں رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، پروین شاکر، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض جیسی عورتیں ابھریں اور ادب میں اپنے دم سے ایک نئی فضا قائم کی۔ بقول محمد حسن:

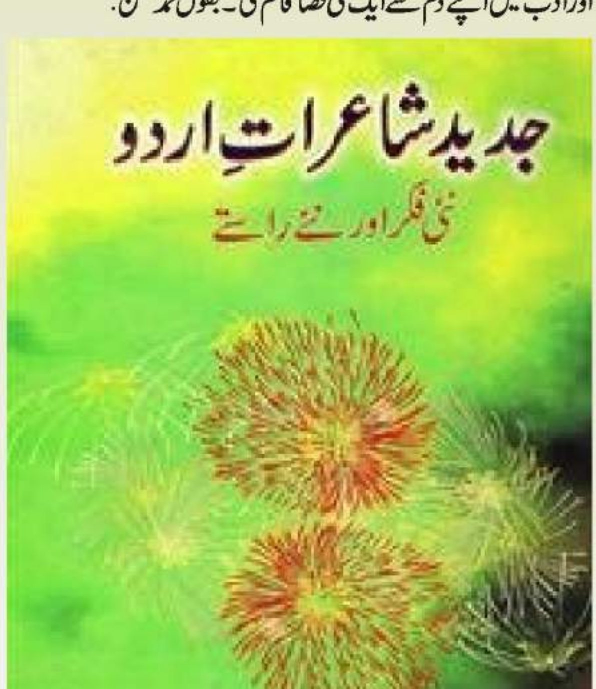

''عورت کے حسن و جمال ،لب و رخسار، زلف و رخ کی تعریف میں کیا کیا نہیں لکھا گیا۔ شاعروں کے دیوان، ناول نگاروں کے ناول، داستان گو حضرات کی داستانیں غرض عالمی ادب کے بیشتر حصے کا موضوع عورت ہے۔ اگر کوئی کوشش کرے تو اس کے جسم کے ہر حصے پر دنیا کی شاعری اور نثر سے بہترین اقتباس جمع کیا جاسکتا ہے۔ اسے دیوی کی طرح پوجا گیا، اس پر جان نچھاور کی گئی، کتنوں نے دیوداس کی سی زندگی گزاری، پھر روحانیت کا دور آیا جس نے عورت کو حسن کا پیکر بنا دیا۔ اس کی ہر ادا کیفیت، ہر جنبش غزل ٹھہری، گویا عورت سراپا ماورائی حور ہوگئی اور اس کا وجود انسانی نہیں سماجی بن گیا''۔ (جدید شاعراتِ اردو، صفحہ 10)

اس مضمون میں راقم الحروف نے کوشش کی ہے کہ ان خواتین تخلیق کاروں کو بحث کا موضوع بنایا جائے جنھوں نے مرد اساس معاشرے میں اپنے صنفی تشخص کے وجود کو منوانے کی قابل قدر کوششیں کیں اور اس دوران بھی یہ تحقیقی و تنقیدی دائرہ لکھنؤ کی شاعرات تک محدود رکھا گیا کیونکہ مضمون کی اپنی تحدیدات ہوتی ہیں۔

لکھنؤ کی اردو شاعرات میں جانی بیگم کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بیگم جان نام اور جانی تخلص کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنا تخلص بیگم جان کی مناسبت سے جانی رکھ لیا تھا جو بازاری محاورہ کا ایک مشہور لفظ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ لفظ اس معنی میں مستعمل نہ تھا جس معنی میں آج کل لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے غزل کا ایک مقطع پیش خدمت ہے جس سے انھوں نے اپنے تخلص کو بڑے سلیقے کے ساتھ نظم کیا ہے:

دل جس سے لگایا وہ ہوا دشمنِ جانی
کچھ دل کا لگانا ہی ہمیں راس نہ آیا

جانی بیگم ایک باکمال شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ باعفت اور بلند اخلاق کی بھی مالک تھیں۔ ان کے اشعار میں زبان کی صفائی، تشبیہ اور بلند معنی کے اسرار نظر آتے ہیں۔ عشق میں کوئی معشوق کی جفا کے شکوے کوچۂ بازار میں بیان کرتا ہے تو کوئی خود معشوق کے سامنے عاجزی اور انکساری کرتا ہے مگر جانی ان سے الگ ہوکر بیان کرتی اور کہتی ہیں:

بیان میں کس سے کروں جا کے اب گلہ دل کا
یہ دل کا ہی نہیں ہوئے گا فیصلہ دل کا

ایک دفعہ جانی بیمار پڑ گئیں، عیادت کرنے والوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ ہمدم نامی ایک مشہور خواجہ سرا نے طبیعت کا حال دریافت کیا تو آنکھ اٹھا کر جواب دیا:

کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جسمِ ناتواں کی
رگ رگ میں نیشِ غم ہی کہیے کہاں کہاں کی

ہمدم نے جب یہ شعر بادشاہ کے حضور میں عرض کیا تو تڑپ گئے

اور بار بار مزے لے کر پڑھتے رہے۔

حسن لکھنوی

لکھنؤ میں گوہر جان ایک طوائف تھی اس کی بیٹی کا نام وزیر جان تھا چونکہ یہ بیحد حسین تھی اس لیے اپنا تخلص حسن مقرر کیا۔انھوں نے ایک غزل ''مراۃ الخیال'' کے مصنف کو برائے اشاعت بھیجی تھی اس غزل سے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔ان اشعار میں شاعرہ کا انداز بیان اور شوخی وشرارت دیکھی جاسکتی ہے:

پہلے یہ چشمِ عنایت اب یہ نفرت کیوں حضور
وہ ستم کیوں کر سہے جو لطف کا خوگر ہوا
وہ مریض غم ہوں میں جس کو دوا آئی نہ راس
سر پہ جب صندل لگایا اور درد سر ہوا
وصل کی شب بھی نہ باز آیا شرارت سے وہ شوخ
مسکرا کر پھیر لی کروٹ ستم ہم پر ہوا

صاحبِ تذکرۃ الخواتین نے ان کو''شاعرہ گرامی'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

دلہن لکھنوی

دبستانِ لکھنؤ کی اہم شاعرات میں دلہن لکھنوی کا شمار ہوتا ہے۔ نواب دلہن بیگم صاحبہ اودھ کے مشہور حکمراں نواب آصف الدولہ کی چہیتی بیگم تھیں۔یہ نواب بہو کے نام سے زیادہ مشہور تھیں اور تخلص دلہن استعمال کرتی تھیں۔کہتے ہیں کہ نواب آصف الدولہ ان کے مجنوں تھے اور دلہن بھی ان سے بہت زیادہ محبت کرتی تھیں ان کے درمیان اکثر سوال وجواب میں شعروشاعری ہوتی رہتی تھی۔

نواب آصف الدولہ نے دلہن صاحبہ کی طرف مخاطب ہوکر یہ شعر کہا:

ساقیا مئے سے جھکا دے کہ بہکتے جائیں
برق کی طرح جدھر جائیں لپکتے جائیں

اس پر دلہن صاحبہ بھی اپنی مست نگاہوں سے خاص طور پر ان کی طرف دیکھ کر یہ شعر بیان کرتی ہیں:

ایسے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکتے جائیں
گُل کی مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں

نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ میں اپنا امام باڑہ اور دیگر عمارتیں تعمیر کیں جو آج بھی ان کے شوق کی یادگار کے طور پر باقی ہیں چنانچہ اسی ذوق میں جب یہ شعر قلم بند کرلیا:

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے
عمارت بناتے چلے جایئے

اس شعر کے جواب میں دلہن بیگم نے بھی ایک غزل کہی اور اس شعر کا جواب اس شعر سے ادا کیا:

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیرِفلک
خانۂ دل جو گرا ہواسے تعمیر کرو

اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ دلہن صاحبہ کے اشعار میں اخلاقیات کا پرتو بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔دلہن نہایت خوش خلق،نیک طبیعت اور صاحب ذوق خاتون تھیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا
تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا
جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں
مثال لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں
دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

زہرہ لکھنوی

ان کا نام امراؤ جان تھا اور یہ دبستانِ لکھنؤ کی مشہور ومعروف طوائفوں میں سے تھیں۔اس نے اپنا تخلص زہرہ رکھا تھا۔اس کی ایک بہن جس کا تخلص مشتری تھا یہ دونوں اپنے دور میں بے حد مشہور رہی ہیں لیکن زہرہ نے آسمان کی مانند شہرت اور داد وتحسین حاصل کرلی تھی۔زہرہ اور ان کی بہن مشتری کا تعلق غالب کے عہد سے تھا بلکہ یہ دونوں غالب کی حریف تھیں۔یہ دونوں بہنیں فارسی اور اردو پر عبور رکھتی تھیں اور اپنے دور کی ممتاز شاعرہ،انشاپرداز اور ماہر رقاصہ تھیں۔انہیں نظم ونثر دونوں پر قدرت حاصل تھی اور دونوں زبانوں میں شعروشاعری کرنے کا سلیقہ رکھتی تھیں۔انھوں نے مشہور شعرا کی غزلوں کے مقابلے میں غزلیں کہیں ان میں تلمیحات، اشارات ہوتے اور گاہ گاہ طعن وتشنیع کے بھی تیر ہوتے اس پر پڑھنے کا انداز غضب کا تھا۔مشاعروں کا یہ عالم تھا کہ جہاں زہرہ شعر پڑھتیں تو ہر ایک شعر نغمہ لاہوت بن جاتا اور یہ ایسے اشعار ہوتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے۔شعروشاعری کے ساتھ ساتھ زہرہ اپنے حسن میں بھی بے مثال تھی بلکہ شعر پڑھتے پڑھتے نگاہوں سے جدھر اشارہ ہوتا،صفیں کی صفیں الٹ جاتیں۔ان کے اشعار میں اس قدر تازگی اور تراوٹ موجود تھی کہ سامعین دل تھام کر رہ جاتے:

حیا سے نہیں وہ جو آنے کے قابل

تو ہم خوف سے کب ہیں جانے کے قابل
کرو خون سے تم مرے ہاتھ رنگیں
یہ مہندی ہے صاحب لگانے کے قابل
رہے عمر بھر قید کنج قفس میں
کہاں بال و پر ہم ہلانے کے قابل

مشاعرہ میں ایک خاص انداز سے بیٹھنا اور پھر اپنی خوبصورت نگاہوں کے جلوے بکھیرنا، کلام کی داد کا ادائے خاص سے جواب دینا، یہ تمام ادائیں تھیں جو پوری محفل کو مسحور کر دیتی تھیں:

آؤ جی آؤ خدا کے واسطے
رحم فرماؤ خدا کے واسطے
یہ تمھارا جاںنثار اب مر چلا
دیکھتے جاؤ خدا کے واسطے
جان جاتی ہے تمھارے ہجر میں
اب لپٹ جاؤ خدا کے واسطے
لو وہ آتے ہیں کوئی کہتا نہیں
اب نہ گھبراؤ خدا کے واسطے

ان کی زندگی میں ایک وہ وقت بھی آیا جب یہ اپنے استاد سے لڑ گئیں اور ان کا مقابلہ کیا۔ اس لڑائی نے اس زمانے میں بہت شہرت حاصل کر لی اور بعض شعرائے وقت کے لیے طبع آزمائی کا سبب بن گئی۔

سردار لکھنوی

سردار لکھنوی زمانۂ غدر کی ایک مشہور شاعرہ رہی ہیں۔ پہلے امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہی تھیں لیکن غدر کے حالات میں سب کچھ لٹ جانے سے دانے دانے کو محتاج ہو گئیں۔ بیوہ ہو کر کانپور اور قنوج چلی گئیں اس کے بعد اِٹاوہ کا رخ کیا اور بقیہ عمر وہیں گزاری۔

ان کی ایک حسین وجمیل بیٹی تھی جس کا نام کاظمی بیگم تھا۔ سردار نے اسے رقص و سرود کی تعلیم دلوائی اور اِٹاوہ میں شہرت حاصل کر لی۔ سردار کے زبان سے نکلنے والے ہر شعر کو کاظمی بیگم شعروشاعری اور رقص کی محفلوں میں گایا کرتی تھی اور یوں انھوں نے خوب شہرت حاصل کر لی۔ سردار بیگم کی حالات زندگی کا ان کی شعروشاعری پر بھی واضح اثر رہا۔

لگایا میں نے جو تم سے دل کو تمہارے دل پر نہاں نہ ہوگا
اٹھائے صدمے ہیں جتنے میں نے جہاں میں کس ترعیاں نہ ہوگا
ہے خوف مجھ کو اکیلے گھر کا کہ ہوگا وہاں پر گذارہ کیوں کر
مدد کو میری جو لطف یزداں ندیم و ہمدم وہاں نہ ہوگا

سردار بیگم کا ایک مشہور شعر پیش خدمت ہے، کہتی ہیں:

نہ لگی آنکھ سحر تلک مجھے یاد اپنی دلا گئے
میرے پاس سے وہ چلے گئے میرے دل کو لے کر ہلا گئے

اپنی عمر کے آخری ایام میں سرداری بیگم زندگی سے بے زار ہو گئی تھیں، چنانچہ فرماتی ہیں:

دل اٹھ گیا میرا زمانے سے
موت آئے کسی بہانے سے

چنانچہ ان کے انتقال نے ادبی حلقوں میں کہرام مچا دیا۔ بڑے بڑے شاعروں نے تعزیتی خط بھیجے، مرثیے لکھے اور تاریخی قطعات بھی شعرا نے بھیجے۔ ان کے فاتحہ خوانی کے لیے اور رسم چہارم کے لیے بھی روپیوں کی بارش ہوئی۔ سردار بیگم آج بھی اپنی شعروشاعری میں زندہ ہیں:

وہ تو ہمارا لے گئے بیٹھے بٹھائے دل
ہرگز نہ کوئی آپ سے اپنا پھنسائے دل
بے جرم مجھ کو یار نے مارا ہے دوستو
اب دل ہی دل میں کہتا ہوں فریاد ہائے دل
ہم تو عاشق اسی کے ہو بیٹھے
دل سے صبر وقرار کھو بیٹھے
یاد ہم کو اسی کی ہردم ہے
دار فانی سے ہاتھ دھو بیٹھے
یہ بھی محشر میں کام آئے گا
کلمۂ مصطفیٰ پڑھو بیٹھے

مذکورہ سطور میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ لکھنوی شاعرات نے اپنے فکروفن کے خوبصورت امتزاج سے جو تخلیقی قوس قزح تشکیل دی اس نے جہاں ایک طرف ادبی منظرنامے پر ایک گہری نقش ثبت کا جس سے بہت دور تک اور دیر تک ان کی شہرت وانفرادیت باقی رہنے کے امکانات ہیں وہیں دوسری طرف مخصوص نسوانی لب ولہجہ کے اظہار کو ایک پرقوت ادبی میلان کے طور پر راہ دی جو مستقبل کی خواتین قلمکاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔

□□□

Altaf Ahmad Mir
Research Scholar
Dept. of Urdu
Khwaja Moinuddin Chishti Language University
Sitapur-Hardoi Bypass Road
Lucknow-226013 (U.P)

زیبا فاروقی

منفرد زبان و بیان کا ناول
''ریت سمادھی''

2022 کے عالمی بکر اعزاز سے نوازا گیا گیتا نجلی شری کا ناول Tomb of Sand بنیادی طور پر ہندی میں لکھے گئے ان کے ناول کا انگریزی ترجمہ ہے۔ ہندی میں یہ ناول ''ریت سمادھی'' کے نام سے جنوری 2018 میں شائع ہوا تھا۔ جون 2022 میں اس کا چھٹا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔ 2021 میں جن دو ہندوستانی ناولوں کو فرانس کے ایملی گیمٹ ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا ان میں سے ایک ریت سمادھی تھا۔ 2022 میں بکر پرائز کا حاصل ہونا ناول کی عظمت کا عالمی سطح پر اعتراف ہے۔

ریت سمادھی کی جو خوبی فوری طور پر قاری کو متوجہ کرتی ہے وہ ہے اس کا بیانیہ۔ ناول کا بیانیہ ابتدا سے ہی قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا آپ ایک دلچسپ نظم پڑھ رہے ہیں جو اپنے ساتھ آپ کو بہائے لیے جا رہی ہے۔ ایک دلچسپ پُراسرار نظم جس میں کہانی بہ یک وقت خود کو چھپاتی اور ظاہر کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ناول کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''ایک کہانی اپنے کو کہے گی، مکمل کہانی ہوگی اور ادھوری بھی، جیسا کہانیوں کا چلن (चलन، روایت) ہے۔ دلچسپ کہانی ہے۔ اس میں سرحد ہے اور عورتیں جو آتی ہیں، جاتی ہیں، آرم پار (आरमपार)۔ عورت اور سرحد کا ساتھ ہو تو خود بہ خود کہانی بن جاتی ہے بلکہ عورت بھر (भर، محض) بھی۔ کہانی ہے۔ سگ بگی (सुगबुगी) سے بھری۔ پھر جو ہوا چلتی ہے اس میں کہانی اڑتی ہے۔ جو گھاس اُگتی ہے، ہوا کی دِشا (दिशा، سمت) میں دیہہ (देह، جسم) کو اکساتی، اس میں بھی اور ڈوبتا سورج بھی کہانی کے ڈھیروں قندیل جلا کر بادلوں پر ٹانگ دیتا ہے۔'' (ص:9)

ناول ایک عمر رسیدہ عورت کی کہانی بیان کرتا ہے۔ یہ بزرگ عورت جو 1947 کی ہولنا کیوں کو عبور کرتی ہوئی ہندوستان کے حصے میں آئی تھی، ماضی کو طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیتی ہے اور ہندوستان میں ایک بھرپور زندگی گزارتی ہے۔ اب وہ ایک اعلیٰ افسر بیٹے اور شہرت یافتہ بیٹی کی ماں ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ماضی کہیں پیچھے چھوٹتا چلا جاتا ہے۔

ماضی سے اس کا رابطہ صرف روزی کے ذریعہ ہے جو وقتاً فوقتاً اس سے ملاقات کرتی رہتی ہے لیکن ان کے درمیان تعلق کے راز سے کوئی واقف نہیں۔ شاید کسی کے نزدیک اس رشتے کی کوئی اہمیت بھی نہیں۔ ناول کی ابتدا اس بزرگ خاتون جواب اماں کے نام سے مقبول ہیں' کی بیوگی سے ہوتی ہے۔ ایک طویل عمر گزار کر اماں کے شوہر اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئے ہیں اور اماں نے ان کے غم میں بستر پکڑ لیا ہے۔ گوشہ نشینی کے اس عالم میں اماں ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنی زندگی کا محاسبہ کرتی ہیں۔ اوراقِ پارینہ ان کی نظروں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں اور بھولا بسرا ماضی دل کے نہاں خانوں میں زندہ ہو اٹھتا ہے۔ وہ دورِ زندگی جوان کی حیات کا سب سے بڑا راز ہے، جس پر وقت کی گرد جم چکی ہے۔ قتل و غارت گری کا دریا عبور کرنے کے بعد جس دنیا نے انھیں اپنی پناہ میں لیا تھا اس کی اولین شرط تھی گزشتہ زمانے کو فراموش کر یہاں کی مٹی میں جڑیں جمانا۔ اماں نے تا عمر اس شرط کو نبھایا لیکن اب ماضی کی بازگشت کو رد کرنا ممکن نہیں۔ ماضی ہی تو اس کی اصل شناخت ہے۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت۔ تو اس سے فرار آخر کب تک۔ رفتہ رفتہ پرانی یادیں عود کر آنے لگتی ہیں اور بے خیالی میں زبان سے ایسے کلمات ادا ہوتے ہیں جو اس کے موجودہ کنبے کے لیے ضعیفی میں ذہن کے شل ہونے کی علامت کے ماسوا کچھ بھی نہیں لیکن اماں دل ہی دل میں تہیہ کر چکی ہیں۔ پاکستان کے سفر کے اُن کے عزم کو اہلِ خانہ روزی کی آخری خواہش کی تکمیل کی آرزو سے تعبیر کرتے ہیں لہٰذا بیٹی ''بیچاری'' اماں کی خوشی کے لیے پاکستان ساتھ جاتی ہے:

''بوڑھی ماں کو کچھ چھوٹی موٹی خوشی چلو دے دیں اس آخری مقام پر۔'' (ص:319)

پاکستان میں یکے بعد دیگرے عجیب و غریب انکشافات بیٹی کو بیحد بیچین کر دیتے ہیں۔ بالآخر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقت محض وہی نہیں جو نگاہوں کے سامنے ہے بلکہ اماں کی ایک دنیا متوازی طور پر بھی چلتی رہی ہے جو اہلِ خانہ کی نظروں سے مخفی لیکن ہمیشہ دائم و قائم ہے۔

ناول دو کرداروں اماں اور روزی کے اردگرد گردش کرتا ہے۔ اماں کا نام چندر پربھا ہے لیکن اوائل عمر میں وہ چندا کے نام سے مقبول تھی۔ لاہور میں اس نے اپنی سہیلی کوثر کے بھائی انور سے محبت کی شادی کی تھی۔ تب اس کی عمر سولہ سال تھی۔ انھیں دنوں ملک کی تقسیم کا غلغلہ ہوا۔ بلوائیوں نے اسے اغوا کر لیا۔ ایک عرصہ تک شر پسندوں کی گرفت میں رہنے کے بعد چندا اور اس جیسی بہت سی لڑکیوں کو رہائی نصیب ہوئی۔ مظلوم لڑکیوں کے اسی گروہ میں روزی بھی تھی جو اس وقت پانچ چھ برس کی ننھی بچی تھی۔ درندوں کے چنگل سے جس جگہ رہائی ملی وہ صحرائی علاقہ تھا۔ لاتعداد ایام صحرا میں روزی کے ہمراہ بھٹکتی رہی۔ بالآخر ایک دن کمزوری کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو ہندوستانی سرحد کے کسی ملٹری ہسپتال میں تھی۔ چندا کے چندر پربھا بننے کی تفصیلات ناول میں ندارد ہیں۔ سولہ برس کی چند اسّی سالہ بیوہ چندر پربھا دیوی کے طور پر ہم سے پہلے پہل روبرو ہوتی ہے۔ ایک عام مشرقی خاتون کی طرح شوہر کے انتقال کے بعد ان کی زندگی پر جمود طاری ہو گیا ہے۔ گھر اور بچوں سے بے نیاز ہو کر وہ گوشہ نشین ہو گئی ہیں۔ اس دوران گزشتہ زمانے کی تصاویر جن پر وقت کی گرد جم چکی ہے، خالی ذہن ان کی ورق گردانی کرنے لگتا ہے۔ لاشعور میں دفن ہو چکے واقعات تحت الشعور کی حدوں کو پار کر کے شعور پر دستک دینے لگتے ہیں۔ انھیں دنوں صحت یابی کی غرض سے بیٹی اماں کو اپنے گھر لے آتی ہے۔ ماں کے بدلتے رویے اور گفتگو کا انداز بیٹی کو اکثر و بیشتر استعجاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بیٹی ماں کو خوش دیکھ کر مطمئن تو ہے لیکن کہیں کچھ تو ہے جو بعید القیاس ہے:

''دل ڈوبا ڈوبا بیٹی کا۔ یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں۔'' (ص:146)

''پر بیٹی کی مسکان وسکان ہلکان (हलकान) ہو چکی تھی اور سب غائب تھا، کیول (केवल، صرف) تراس (त्रास، غم) رہ گیا تھا جو خود پر تھا۔'' (ص:229)

اماں کی بے نیازی میں بتدریج اضافہ ہوتا جاتا ہے۔تمام رشتوں ناطوں سے لاتعلق ہوکر اماں روزی، پیڑ پودوں اور پرندوں میں محو ہیں۔ بیٹی کے دورِ بلوغت میں اماں نے اسے ایک آزادانہ زندگی بسر کرنے اور معاشرے میں عزت دار مقام حاصل کرنے کی جدوجہد میں بھرپور تعاون کیا تھا۔لیکن حقوقِ نسواں کی علمبردار عالی مرتبہ بیٹی اپنی ماں کی ضعیف جوانی کو قبول کرنے پر راضی نہیں۔ ماں نے بھی کبھی بیٹی کو اپنے ماضی کی رازدار نہیں بنایا۔لہٰذا اب جبکہ اماں اپنے باطن میں ماضی کی بازیافت کررہی ہیں اور پاکستان جانے کو بضد ہیں تو سبھی ششدر رہ جاتے ہیں:

''جیسے ایک ایک کرکے سارے اوڑھنے اتار دیے ہوں،
بیوی، اماں، چاچی، بوا (बुआ، پھوپھی) عین شین کے اور
آخرکار بس وہ ہی ہے، اگھڑی (उघडी)، اجنبی، اپنی، کسی اور
کے خیال یا فکر سے اچھوتی۔
اسّی سال پے ماں سوار تھی (स्वार्थी، مطلبی) ہوگئی۔''
(ص:263)

پاکستان پہنچ کر بیٹی کے سامنے ماں کے راز رفتہ رفتہ بے نقاب ہوتے ہیں۔اتنے بڑے ذہنی خلفشار سے نبرد آزما ہونا کارِ سہل نہیں۔زندگی کی یکسر نئی اور غیر متوقع نہج بیٹی کو حواس باختہ کردیتی ہے جبکہ اماں پرسکون ہیں کیوں کہ ان کے لیے یہ گھر واپسی کا عمل ہے۔بالآخر اماں اپنی محبت اور شوہر انور سے ملاقات میں کامیاب ہوتی ہیں۔زندگی کے آخری ایام میں ایک سیاہ رات ان کی اس ملاقات کی گواہ ہے۔وقت کا دریا ایک دفعہ پھر انھیں اسی موڑ پر لے آیا ہے جہاں سے اس نے اپنی سمت بدلی تھی۔ایک دفعہ پھر انور کا ہاتھ ان کے ہاتھوں میں ہے۔بھلے ہی حالات، زمانہ، وقت سبھی کچھ تبدیل ہوچکا ہے لیکن بالآخر محبت نے بازی جیت لی ہے۔منزل دیر سے ہی سہی لیکن حاصل ہوگئی ہے۔اماں کا کردار اپنے اندر مختلف شیڈس سمیٹے ہوئے ہے۔خانہ داری کی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بھی پہلی محبت کی مدھم لو بجھنے نہیں پاتی۔زمانے کی تمام پابندیوں کے درمیان رہ کر بھی اماں بیٹی کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی نہ صرف حمایت کرتی رہی ہیں بلکہ حتی الامکان مدد بھی کرتی ہیں۔ایک روایتی ہندو گھرانے میں یہ تقریباً ناممکن ہے۔ بڑے بھائی کی سخت مخالفت اور ناراضگی کے باوجود بیٹی اگر معاشرے میں بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکی ہے تو اس کے پسِ پشت ماں کی محنت، بلاشرط محبت اور بیٹی کی خواہشات کے احترام کا جذبہ کارفرما ہے لیکن جب بیٹی کے روبرو ماں کے تئیں انھیں جذبات کا امتحان درپیش ہے تو وہ سخت ہیجان میں مبتلا ہوجاتی ہے۔

ناول کا دوسرا اہم کردار روزی ہے۔وہ بچی جو ہنگامہ ہائے محشر کے دوران چندا کے ہمراہ تھی، تاعمر اس کا ساتھ دیتی ہے۔ روزی Transgender مخنث ہے۔ہندوستان کی سرحد میں پناہ لینے کے بعد کبھی یتیم خانے، کبھی سکھ لنگر اور کبھی گرجا گھر کے سہارے اس کی زندگی آگے بڑھتی ہے۔اپنی حقیقت کا تلخ احساس اسے دوہری زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے۔ایک جانب وہ ٹیلر ماسٹر رضا ہے جو نہایت شائستگی سے گفتگو کرتا ہے اور اپنے پیشے میں ماہر ہے۔ دوسری جانب وہ روزی ہے جو اپنے مخصوص کنبے کی شناخت ہے اور بیحد فعال ہے۔اماں کے بیٹی کے گھر منتقل ہونے کے بعد روزی اور اماں کے تعلقات میں مزید قربت پیدا ہوجاتی ہے۔ان کے رشتے کی حقیقت سے بے خبر بیٹی اس قربت کو پسند نہیں کرتی لیکن ماں کی خوشی کی خاطر سب گوارا کرتی ہے۔روزی اماں کے لیے اپنے ماضی سے تعلق قائم رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔روزی کی موجودگی چندا کے وجود کی ضامن ہے۔روزی کے ذریعہ وہ اپنے ماضی کی بازگشت کرتی آئی ہیں۔روزی کی موت کے بعد لاہور کے سفر کے علاوہ ماضی سے ملاقات اور خود سے روبرو ہونے کا کوئی راستہ ممکن نہ رہا۔

ریت سمادھی یعنی ریت کا دفینہ۔دفینے میں عموماً نادر و نایاب اشیاء دریافت ہوتی ہیں۔صحرا میں ریت کی آندھیاں چلتی ہیں جو قرب و جوار کی ہر شے کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں اور ان پر ریت کا ذخیرہ اس طرح جمع ہوجاتا ہے کہ اس شے کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔پھر رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ وہ ریت زائل ہونے لگتی ہے اور ایک دن ریت میں دفن اشیاء اپنی اصل شناخت کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں۔ریت سمادھی نام علامت ہے اماں کے ماضی کی جو وقت کی تہوں میں دفن ہوگیا ہے۔شوہر کے انتقال کے بعد جب ان کی زندگی میں جمود آتا ہے تو ماضی کا احاطہ کرنے والی ریت آہستہ آہستہ ہٹنا شروع ہوتی ہے۔پاکستان کا سفر ان کے ماضی کو نئی آب و تاب کے ساتھ روشن کردیتا ہے۔یعنی ریت میں سمادھی (دفینہ) کوئی مستقل خاتمہ نہیں ہے بلکہ ایک نئی آگہی کی جانب مراجعت کا ذریعہ ہے۔ یہ آگہی بہت سے نئے پرانے رنج و انبساط کے لمحات ہمراہ لائی ہے اور بعض کے لیے زندگی میں نئے معنی اور نئے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ قائم شدہ رشتے اور سرحدیں بے معنی ہوجاتے ہیں اور بہت سے غیر ضروری اور غیر واضح تعلقات میں رشتوں کے نئے باب وا ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ماں کی تسکین کی خاطر لاہور کا سفر اختیار کرنے والی بیٹی اس امر سے ناواقف ہے کہ وہاں ایک نئی، نامانوس اور قطعی مختلف دنیا اس کا انتظار کررہی ہے جس سے مراجعت کبھی ممکن نہیں ہوگی۔

ریت سمادھی میں کہانی آہستہ آہستہ اپنے ابعاد کو روشن کرتی ہے۔ انجام تک پہنچتے پہنچتے ناول میں ایسے حیرت انگیز پہلو ظاہر ہوتے ہیں کہ قاری استعجاب میں غرق ہو جاتا ہے۔ ناول میں کئی دفعہ اساطیری حوالے بھی آئے ہیں۔ متعدد مصنفین اور ان کی تصانیف کا بھی گاہے بہ گاہے ذکر ہے جو برصغیر ہند کی تقسیم کے گواہ بنے۔ اس خوں چکاں دور کو بذاتِ خود دیکھا، محسوس کیا اور اپنی کاوشوں میں مختلف زاویوں سے پیش کیا۔ البتہ ان حوالوں کی معنویت وہی سمجھ سکتا ہے جس نے ان تخلیقات کا مطالعہ کیا ہو۔ چند مثالیں دیکھیے:

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر چلے تھے یار کہ مل
جائے گی کہیں نہ کہیں

(ص 146 بحوالہ صبح آزادی، از فیض احمد فیض)

بدھائی۔ ڈاکٹرنی نے کہا۔ نہیں، لڑکا، لڑکی، سائیکل نہیں
کہا۔ (ص 223، بحوالہ ٹوپی شکلا از راہی معصوم رضا)

بشن سنگھ بھی ایک ہاتھ کان پر لگائے، دوسرا آنکھ پر، آواز
کو غور سے سننے کی مدرا میں آ جاتا ہے۔

(ص 269 بحوالہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، از سعادت حسن منٹو)

جو نہ دیکھنا تھا وہ بھی دیکھ لیا۔ آگے دیکھنے کی تاب نہیں
ہے۔ (ص: 271 بحوالہ بستی، از انتظار حسین)

بلاشبہ ادب کا ایک سنجیدہ قاری ہی ان جملوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ناول میں ہندو پاک کے گزشتہ بیس، پچیس برس کے واقعات کا بھی جا بجا ذکر آیا ہے، جس سے ناول کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ناول کا سب سے قوی پہلو اس کا بیانیہ ہے جو قاری کے سامنے معنویت کے بہت سے جہات روشن کرتا ہے۔ تہہ دار جملے سنجیدہ قاری کو بے ساختہ اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ ناول کے کرداروں میں کوّا بھی شامل ہے، سڑک بھی، گھر کا دروازہ اور ایک بے نام دوست بھی۔ الگ الگ مواقع پر یہ سبھی راوی کا کردار ادا کرتے ہیں اور اپنے مخصوص مشاہدے کے ذریعہ واقعات کے ایک مختلف رخ کو قاری کے روبرو پیش کرتے ہیں۔ حقیر پرندہ کوّا اماں کے کنبے کے دکھ سکھ میں برابر کا شریک ہے لیکن انسان ان کی زبان سمجھنے اور اس کی ہمدردیاں وصول کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم اس کی مستقل موجودگی انسانوں کو اس کے خلوص کا احساس تو کروا ہی دیتی ہے۔ سڑک تقسیم ملک کے دور کے خونیں واقعات کی گواہ ہے۔ جب راحت صاحب ایک طویل عرصہ کے بعد بھی اس مقام پر آتے ہیں جہاں وہ عہد طفلی میں ان واقعات کا حصہ رہے تھے تو سڑک انہیں پہچان لیتی ہے اور شفقت سے انھیں اپنی آغوش میں سمیٹنا چاہتی ہے، گویا وہ ابھی بھی وہی معصوم بچے ہوں جو اس سڑک پر آنے والے قتل و خون کے سیلاب میں زندہ بچ گیا تھا۔ اسی طرح اماں کے بڑے بیٹے 'بڑے' کے گھر کا دروازہ اردگرد کی تمام حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے۔ یہ دروازہ بدلتے ہوئے زمانے اور رسوم و رواج کا گواہ ہے۔ تبدیلیِ حال اکثر اسے حیرت و استعجاب میں غرق کر دیتی ہے۔ سدھارتھ کا بے نام دوست ناول میں کوئی کردار نہیں نبھاتا تاہم وقتاً فوقتاً اہم مواقع پر موجود ہوتا ہے اور واقعہ کی تمام جزئیات کی کامیاب تصویر کشی کرتا رہتا ہے۔ یہ بے نام بے چہرہ شخص ہی اماں کی آنکھوں میں قوس قزح کے رنگوں کو اترتے ہوئے دیکھتا ہے جو دراصل اماں کے نئے ذہنی رویوں کے غماز ہیں۔ کوّے اور سڑک کا بیان جہاں ہمدردی اور یگانگت کے جذبات سے پُر ہے وہیں سدھارتھ کا دوست بے فکر و خوش مزاج نوجوان ہے جو مذاق مذاق میں ہی بڑے انکشافات کر جاتا ہے اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے لیے قاری کو ذہنی طور پر تیار کرتا ہے۔

ناول نگار نے ایک معصوم اور مختصر داستانِ عشق کی بنیاد پر ایک خوبصورت کہانی تخلیق کی ہے جس میں زندگی کے سبھی رنگوں کا امتزاج ہے۔ معصوم محبت کی یہ داستان اس انداز میں مکمل ہوتی ہے کہ قاری کو تشنگی کا احساس نہیں ہوتا تاہم ایک موہوم سی حسرت دل میں خلش پیدا کرتی ہے۔ یہی ناول کی کامیابی ہے کہ ہم خود کو اس کی مرکزی کردار اماں یا چندا سے جوڑ لیتے ہیں اور ناول کے غیر متوقع انجام پر مطمئن بھی ہوتے ہیں اور افسردہ بھی۔ ناول کی تکنیک بے مثال ہے جو گیتانجلی شری سے ہی عبارت ہے۔ بیانیہ میں الفاظ کی بازی گری متاثر کرتی ہے۔ زبان ایسی گویا نثر لکھتے لکھتے مصنفہ کے جذبات و محسوسات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی خاطر پُراسراری نظم شروع ہو جائے۔ یہی شاعرانہ نثر ناول کے بیشتر حصوں کا احاطہ کرتی ہے اور ایک حساس قاری کے لیے ذہنی تلذذ کا سامان مہیا کرتی ہے۔

نوٹ: مضمون میں شامل اقتباسات ریت سمادھی کے ہندی متن مطبوعہ راج کمل پیپر بیکس (Rajkamal Paperbacks)، 2022 سے اخذ کیے گئے ہیں۔

□□□

Dr. Zeba Farooqui
Asstt. Professor
Mahatma Gandhi Girls, P.G. College
Firozabad-283203 (UP)

کھانا اور اردو شاعری

ناہیدہ شبیر خان

ارباب عقل و دانش کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ اللہ کے دیدار کا شرف حاصل کریں، لیکن اس کے شرف کے حصول کا ذریعہ علم وعمل کا مجموعہ ہے۔علم کی تحصیل اور عمل کی مداومت جسمانی قوت وطاقت اور سلامتی کے بغیر ممکن نہیں ہے اور جسم کی سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ انسان وقت اور ضرورت کے مطابق غذا استعمال کرے۔اسی لیے کسی بزرگ کا قول ہے کہ کھانا بھی دین کا ایک جز ہے۔ پروردگار عالم نے بھی غذا کی اہمیت سے آگاہ فرمایا ہے۔

کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَ اعْمَلُوا صالِحاً۔ پاکیزہ سامان میں کھایا کرو اور نیک عمل کرتے رہو۔(سورۃ المؤمنون آیت 51)

شریعت وسنّت کے مطابق حلال کھانا کارِثواب ہے۔ کھانے سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم پڑھنا سنّت ہے۔

کہتے ہیں ادب اور چائے کا بڑا پرانا یارانہ اور ساتھ ہے۔چائے نہ ہو تو ادبی سرگرمیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔مثلاً چائے اور اردو اخبار کا تعلق چولی دامن کا ہے۔صبح کی چائے بغیر اردو اخبار کے مزہ نہیں دیتی اور اسی طرح اردو اخبار چائے کے ہوٹل میں بیٹھ کر پڑھنے میں وہ مزہ آتا ہے جو خرید کر گھر کے لان میں بیٹھ کر پینے میں نہیں آتا۔اس وقت شہروں اور قصبات میں بلکہ بازاروں میں حقیقی معنوں میں اردو کے قارئین انھیں چائے کے ہوٹلوں میں نظر آتے ہیں۔ جدھر دیکھیں ایک ایک خبر پر دسیوں لوگ سر جمائے بیٹھے بحث کرتے نظر آتے ہیں اور اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ پورا اخبار کسی کے پاس نہیں رہتا بلکہ دو پیج کسی کے پاس ہے تو ایک ٹکڑا کوئی اور لیے ہوئے ہے۔

چائے خانے ایسی بیٹھک ہوتے ہیں جہاں ادبی گفت وشنید اور چائے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔اچھی کتاب کو چائے کے بغیر پڑھنا کتنا مشکل ہے یہ صرف قاری جانتا ہے۔اردو شاعری بھی چائے کے بغیر سننا یہ صرف سامع جانتا ہے۔چائے پر لکھے گئے ہزاروں شعر اس بات کے غماز ہیں کہ

شاعر اور چائے کا رشتہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور آئینے سے بھلا چائے کیسے چھپ سکتی ہے۔اردو ادب میں کلام شاعر بہ زبان شاعر بغیر چائے ادھورا رہتا ہے۔ان کی رومانی شاعری ہو یا اداس نظم اس کا تذکرہ ضرور نظر آئے گا۔اردو شاعری میں چائے کا تصور یقیناً ایک وسیع موضوع ہے جسے چند صفحات میں سمیٹنا ناممکن ہے۔کسی نے کیا خوب کہا کہ ''اچھی کتاب اچھے شعر اور اچھی چائے سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوسکتی۔''اس لیے آپ کے ذوق کی تسکین کے لیے چند اشعار حاضر ہیں مگر اپنے لیے چائے خود بنوالیں۔۔۔۔۔

چائے میں چینی ملانا اس گھڑی بھایا بہت
زیرِ لب وہ مسکراتا شکریہ اچھا لگا

امجد اسلام امجد

چائے کی پیالی میں نیلی ٹیبلٹ گھولی
سہمے سہمے ہاتھوں نے اک کتاب پھر کھولی

بشیر بدر

سگرٹیں چائے دھواں رات گئے تک بحثیں
اور کوئی پھول سا آنچل کہیں نم ہوتا ہے

والی آسی

ذرا سی چائے گری اور داغ داغ ورق
یہ زندگی ہے کہ اخبار کا تراشا ہے

عامر سہیل

شعر جیسا بھی ہو اس شہر میں پڑھ سکتے ہو
چائے جیسی بھی ہو آسام میں بک جاتی ہے

منور رانا

یہ مہمان نوازی ہے یا اور ہے کچھ
میرے لیے وہ چائے بنا کے لائی ہے

وصی شاہ

آ ترے سنگ ذرا پینگ بڑھائی جائے
زندگی بیٹھ تجھے چائے پلائی جائے

شمیم عباس

گھی مصری بھی بھیج کبھی اخباروں میں
کئی دنوں سے چائے ہے کڑوی یا اللہ

ندا فاضلی

آج پھر چائے بناتے ہوئے وہ یاد آیا
آج پھر چائے میں پتی نہیں ڈالی میں نے

ترونا مشرا

دال میں کالا، دال نہ گلنا، یہ منہ اور مسور کی دال، گھر کی مرغی دال برابر۔۔

ان تمام محاوروں میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ یہ سب ایک ایسی چیز کے گرد گھومتے ہیں جو ہم سب کی پسندیدہ ہے، جس کی کئی قسمیں ہیں، جسے کھا کہ بس سکون سا آجاتا ہے، یعنی دال۔

ہم سب نے نہ صرف یہ محاورے سن رکھے ہیں بلکہ اکثر اپنی گفتگو میں استعمال بھی کر چکے ہیں، لیکن کبھی سوچا ہے کہ یہ محاورے شروع کہاں سے ہوئے اور ان سب میں قدر مشترک دال ہی کیوں ٹھہری؟

ان محاوروں کے بدلتے معانی کے ساتھ ساتھ، یہ چیز بھی بدل جاتی ہے کہ آخر دال سے ہماری مراد کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تاریخ میں مختلف مقامات پر مختلف محاوروں کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت دال کی قدر و قیمت کیا تھی۔

مثلاً، ہوسکتا ہے 'یہ منہ اور مسور کی دال' کا محاورہ تب آیا ہو جب باقی دالوں کے مقابلے میں مسور بہت مہنگی ہوگئی ہو اور ہر کوئی اسے نہ خرید سکتا ہوں۔یوں ان دنوں میں اگر کسی کی تضحیک مقصود ہوتی، تو لوگ کہتے کہ یہ منھ۔

ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے،''دال بڑا مال''۔بچپن میں تو ہمیں سمجھ نہیں آئی کیونکہ دال ہمیں کبھی نہیں بھائی۔لیکن آج بڑے ہو کر دال کی افادیت نے ہماری حیرانگی بڑھائی کہ دال واقعی بڑی خوبیوں سے مالا مال ہے، بچے اور بوڑھوں کی یکساں پسند ہے، خاص وعام کی ضرورت ہے، کئی امراض کا علاج اور ہر گھر میں بچھے دسترخوان کی زینت ہے۔دالیں دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں کاشت کی جاتی ہیں اور انھیں انسانی خوراک میں اہم مقام حاصل ہے۔ جہاں لوگوں کی اکثریت سبزی خور ہے وہاں غذا کا بڑا حصہ اناج اور دالوں پر مشتمل ہے۔

اقوام متحدہ کے تحت سال 2016 کو دنیا میں سب سے زیادہ پکنے والی ڈش ''دال'' سے منسوب کیا تھا، یعنی 2016 کو دال کا سال قرار دیا گیا تھا، جس کا مقصد دنیا بھر کے عوام میں دالوں کی غذائی افادیت کا شعور اجاگر کرنا ہے۔دالوں میں پائی جانے والی پروٹین تندرستی کی ضامن ہے۔ یہ کم خرچ لوگوں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے اس لیے کم آمدنی والے گھرانوں کے لیے گوشت کا درجہ حاصل ہے۔دنیا کے کچھ ممالک میں اسے خوش نصیبی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔اطالوی روایات کے مطابق نیا سال دال اور ساسیج کھا کر منایا جاتا ہے۔دال چونکہ سکّوں کی طرح گول ہوتی ہے اس لیے اسے دولت کی فراوانی کی علامت اور ساسیج کو کامیابی اور

خوشحالی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح جنوبی امریکہ میں دال چاول اور گوشت کے پکوان سے نئے سال کا آغاز کیا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں مصر کے مقابر میں بھی دال کے اثرات پائے گئے ہیں یعنی دفناتے وقت قبر میں دال بھی رکھی جاتی تھی۔ 18 ویں صدی میں فرانسیسی شہنشاہ لوئی پنج دہم کی ملکہ ماریہ نے شاہی دسترخوان پر دال کو فوقیت دی اور وہ ملکہء دال کہلائیں۔ شاید یہ وہی مسور کی دال ہے جسے ہم آپ 'ملکہ مسور' کہتے ہیں۔ مسور کی دال دل کو سبک اور نرم کرتی ہے اور آنکھ سے پانی کے اخراج کو کم کرتی ہے۔ نہ صرف مسور کی دال بلکہ ہر قسم کی دالیں بہت سی بیماریوں کا علاج ہیں۔

عالمی ادب کے منظر نامے پر دیگر زبانوں کی طرح اُردو ادب میں بھی مزاحمت کی ایک مستحکم روایت موجود ہے۔ مزاحمت ہمارے ادب کے خمیر میں رچی بسی ہے۔ بلاشبہ، نثر کے مقابلے شاعری کا جادو ہر خاص و عام کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ مثال کے طور پر اسماعیل میرٹھی کی نظم ''دال کی فریاد'' ملاحظہ فرمائیں۔

دال کرتی ہے عرض یوں احوال
ایک دن تھا ہری بھری تھی میں
ساری آفات سے بری تھی میں
تھا ہرا کھیت میرا گہوارہ
وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا
پانی پی پی کے تھی میں لہراتی
دھوپ لیتی کبھی ہوا کھاتی
مینہ برستا تھا جھونکے آتے تھے
گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے

(''دال کی فریاد''، اسماعیل میرٹھی)

روٹی وہ چیز ہے جو ہر انسان کو ہر حال میں مست رکھتی ہے۔ روٹی کمانے کے لیے کوئی کوئی آدمی اپنے کپڑے لال کیے ہوئے رہتا ہے اور کسی کسی کے بال بڑھے ہوئے رہتے ہیں۔ دنیا بھر میں طرح طرح کے کمال صرف اس روٹی کو حاصل کرنے کے لیے دکھائے جاتے ہیں۔ روٹی کے لیے انسان کی جدوجہد ازل سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ ''روٹی'' کے موضوع پر لکھے گئے چند مشہور و معروف شعراء کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پرائی آگ پہ روٹی نہیں بناؤں گا
½ میں بھیگ جاؤں گا چھتری نہیں بناؤں گا

تہذیب حافی

کھو گیا آج کہاں رزق کا دینے والا
کوئی روٹی جو کھڑا مانگ رہا ہے مجھ سے

جاں نثار اختر

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے! چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں

ندا فاضلی

یہی پوچھا کیا میں آج دن بھر
ہر اک انسان کو روٹی ملی کیا

جون ایلیا

اس نگری میں کیوں ملتی ہے روٹی سپنوں کے بدلے
جن کی نگری ہے وہ جانیں ہم ٹھہرے بنجارے لوگ

جاوید اختر

کیا سوانگ بھرے روٹی کے لیے عزت کے لیے شہرت کے لیے
سنو شام ہوئی اب گھر کو چلو کوئی شخص اکیلا گھر میں ہے

عبیداللہ علیم

روکھی روٹی بھی سدا بانٹ کے جس نے کھائی
وہ بھکاری تو شہنشاہوں سے بڑھ کر نکلا

گوپال داس نیرج

بیلوں کو اک گٹھری گھاس انسانوں کو دو روٹی
کھیتوں کو بھر گیہوں سے کاندھوں کو ہل دے مالک

شکیل اعظمی

گرم دوپہروں میں جلتے صحنوں میں جھاڑو دیتے تھے
جن بوڑھے ہاتھوں سے پک کر روٹی پھول میں ڈھلتی تھی

حماد نیازی

اچھی گزر رہی ہے دل خود کفیل سے
لنگر سے روٹی لیتے ہیں پانی سبیل سے

احمد جاوید

سبزیات انسانی غذا میں بہت اہم مقام رکھتی ہیں کیونکہ ان میں وہ تمام اجزا پائے جاتے ہیں جو اکثر اجناس میں بہت قلیل مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ سبزیات میں لحمیات، حیاتین اور معدنی اجزا بکثرت پائے جات ہیں جو انسانی جسم میں مختلف افعال کو درست رکھنے میں معاون ہوتے ہیں۔

سبزیوں کا استعمال براہ راست سلاد کی شکل میں یا ابال کر یا ہنڈیا میں پکا کر یا کچھ سبزیات مصالحہ جات کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں جن

سے نہ صرف خوراک کو خوش ذائقہ بنایا جاسکتا ہے بلکہ ان کی غذائی اور طبی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ سبزیات میں موجود کچھ اجزا جسم میں بیماری کے خلاف قوت مدافعت پیدا کرتے ہیں، ہمارے جسم کی نشوونما اور بڑھوتری میں معاون ہوتے ہیں اور انسانوں کو مختلف بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سائنسدان سبزیوں کو حفاظتی خوراک (ProtectiveFood) کا نام دیتے ہیں کیونکہ ان کا مناسب مقدار میں باقاعدہ استعمال انسان کو مختلف بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ خوراک میں سبزیوں کے کم استعمال کی وجہ سے جسم میں خون کی کمی ہو جاتی ہے۔ سبز پتوں والی سبزیوں (پالک، سرسوں کا ساگ اور میتھی) میں معدنی نمکیات لوہا، چونا اور فاسفورس کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں جو جسم میں خون کی کمی، ہڈیوں اور دانتوں کی کمزوری کو دور کرتے ہیں۔ کچھ سبزیوں (پیاز اور لہسن) میں ایسے کیمیائی مرکبات موجود ہوتے ہیں جو شریانوں میں فالتو چربی کو جمنے نہیں دیتے اور اسے تحلیل کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے انسان دل کی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ سبزیاں زود ہضم اور ریشہ دار ہونے کی وجہ سے انسانی جسم سے تمام فاسد مادوں کو نکال باہر کرتی ہیں۔

عالمی تنازعات، موسمیاتی تبدیلی اور کووڈ کے بعد پیدا ہونے والے معاملات کی وجہ سے اناج کے بحران نے بھی سر اٹھا لیا، جس کے باعث عالمی سطح پر بہت سے مسائل نے جنم لیا ہے۔

اس حوالے سے اقوام متحدہ نے دنیا کو خبردار کیا ہے کہ اگر ضروری اقدامات نہ کیے گئے تو اناج کا موجودہ بحران 2023 میں عالمی تباہی میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام کے مطابق اس وقت 45 ممالک میں تقریباً 50 ملین افراد قحط کی دہلیز پر ہیں جبکہ دنیا بھر میں 800 ملین سے زیادہ لوگ ہر رات بھوکے سوتے ہیں۔ ندا فاضلی کی یہ غزل موجودہ حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو
اگر نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو
رہے گی وعدوں میں کب تک اسیر خوشحالی
ہر ایک بار ہی کل کیوں کبھی تو آج بھی ہو
نہ کرتے شور شرابہ تو اور کیا کرتے
تمہارے شہر میں کچھ اور کام کاج بھی ہو
حکومتوں کو بدلنا تو کچھ محال نہیں
حکومتیں جو بدلتا ہے وہ سماج بھی ہو
بدل رہے ہیں کئی آدمی درندوں میں
مرض پرانا ہے اس کا نیا علاج بھی ہو
اکیلے غم سے نئی شاعری نہیں ہوتی
زبان میر میں غالب کا امتزاج بھی ہو

(''ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو''، ندا فاضلی)

آم کو پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے اور اس دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو آم کے ذائقے سے ناواقف ہو۔ یہ ہندوستان کا قومی پھل بھی ہے۔ آم گرمیوں کے موسم میں اُگتا ہے۔ اس کی کاشت تقریباً 6000 سال قبل شروع ہوئی تھی۔ پوری دنیا میں آموں کی تقریباً 1500 اقسام پائی جاتی ہیں

ہمارے ملک میں ہر موسم کے پھل موجود ہیں۔ اس وقت موسم گرما اپنے جوبن پر ہے اور اس موسم کا ایک بہت خاص پھل آم ہے، جس کا بڑے بوڑھے، بچے، جوان سب بے صبری سے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ اب یہ انتظار ختم ہو چکا ہے اور آم اب ٹھیلوں، دکانوں اور بڑے بڑے مالز کے شیلف پر اپنی دلکشی، خوبصورتی اور رعنائی کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں نظر آرہا ہے۔

آم کا تعلق ہماری روایات اور تہذیب سے بھی ہے جو ادیبوں، شاعروں سیاستدانوں اور امرا سب میں یکساں مقبول ہے۔ ''آم'' کے موضوع پر لکھے گئے چند مشہور و معروف شعراء کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

آم تیری یہ خوش نصیبی ہے
ورنہ لنگڑوں پہ کون مرتا ہے

ساغر خیامی

اثر یہ تیرے انفاس مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

اکبر الہ آبادی

□□□

Nahida Shabbir Khan
Hindustani Prachar Sabha No. 7,
Mahatma Gandhi Memorial Building
Netaji Subhash Road,
Charni Road
Mumbai - 400002 (M.S)

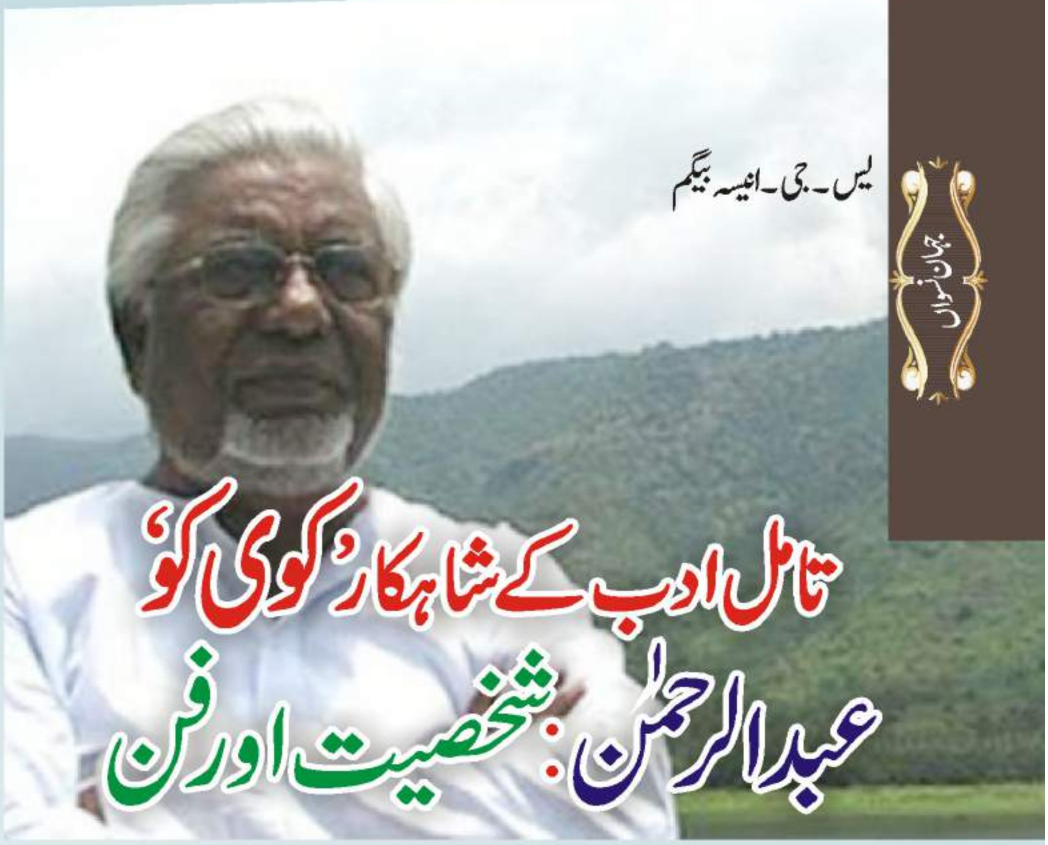

تامل ادب کے شاہکار 'کوی کوٗ' عبدالرحمٰن: شخصیت اور فن

ایس۔جی۔انیسہ بیگم

کوی کو عبدالرحمٰن 9 نومبر 1937 کو سنگم ادب کے مرکز مدورائی میں پیدا ہوئے، آپ کے والد سید احمد عرف مہدی اور والدہ زینت بیگم تھیں۔ شاعری آپ کو وراثت میں ملی تھی، آپ کے والد اردو کے شاعر اور دادا بھی اردو و فارسی دونوں زبانوں کے نامور شاعر تھے۔ عبدالرحمٰن نے اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد مدورائی کے تھیاگ راسر کالج میں داخلہ لیا اور وہیں سے تمل ادب میں گریجویشن اور ماسٹرز کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس وقت کے ان کے استادوں میں ڈاکٹر راجہ مانیکا نار، اوی طورائی سوامی، اے۔کے۔ پرنتھامنار وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کالج کے زمانے سے ہی گرامر، ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور ساتھ ہی شاعری بھی شروع کی۔ آپ مولانا جلال الدین رومی، علامہ اقبال، ٹیگور اور خلیل جبران وغیرہ کی شاعری کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان شعرا سے متاثر ہو کر انھیں کا انداز لانے کی ایک کامیاب کوشش کی۔ آپ کالج میں منعقد ہونے والے تمام شعری مقابلوں میں حصہ لیتے تھے اور اول انعام کے حقدار قرار پاتے تھے۔ آپ کی شاعری لوگوں کے دلوں پر راج کرنے لگی، اسی وجہ سے آپ کو ''کوی کوٗ'' (lit.Emperor among poets) کے خطاب سے نوازا گیا۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ کے لیے تمل اخبار ''تمل ناڈو'' میں ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ پھر 1961 میں وانمباڑی کے اسلامیہ کالج میں بحیثیت تامل لکچرر آپ کا تقرر ہوا۔ آپ رفتہ رفتہ لکچرار، اسسٹنٹ پروفیسر سے ترقی کرتے ہوئے ایسوسیٹ پروفیسر کے عہدے تک پہنچ کر 1991 میں سبکدوش ہوئے، اپنی ملازمت کے دوران بیس سال تک شعبہ تمل کے صدر کی حیثیت سے آپ اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اسی دوران ''کوی راتری'' کے نام سے جدید شاعری تھیٹر کے پروگرام منعقد کیے۔ ایک پروفیسر کے طور پر اپنے دور میں انھوں نے ہزاروں لوگوں کو پدھو کاویدائی (Pudhu) Kavidhai سے لطف اندوز کیا۔ طلباء کو نئی شاعری لکھنے پر اکسایا اور ان کی نظمیں مرتب کیں اور انھیں کتابوں میں شائع کیا۔

آپ نے ''پڈو کاویدیل کوریئو'' (Puddhu Kavidayil Kuriyedhu) کے موضوع پر تحقیق کرنے کے بعد مدراس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ دراوڈن ناڈو، دراوڈن، ٹینڈرل، انامکم، منرم، وکاڈن وغیرہ کئی رسائل میں آپ کی مختصر کہانیاں شائع ہوئیں۔ اگرچہ آپ نے تمل ادب کے کئی شعبوں میں اپنی شناخت بنائی لیکن وہ ایک شاعر کے طور پر زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کی فلسفیانہ نظموں کو خوب پزیرائی ملی۔ آپ ''وانمباڑی'' تحریک کے ممتاز شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

آپ کے شعری مجموعہ میں ''پال ویدی'' کے علاوہ ''نیر ویروپم'' (Nayyer Viruppam) ''سوٹو ویرل'' (Suttu Viral) اور ''پتھن'' (Pitthan) وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کا مجموعہ ''پتھن'' تامل ادب میں نایاب ہے۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''پال ویدی'' (Paal Veedhi) 1974 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں نئی نظمیں ہیں جن میں خیال اور تخئیل کو اس طرح جمع کیا گیا ہے جیسے دودھ کشید کر کے ایک دوسرے سے باندھ دیا گیا ہو۔ پھر 1999 میں لکھے گئے شعری مجموعے ''آلا پنائی'' (Aalapanai) کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے آپ کو نوازا گیا۔ اس کے ذریعے آپ نے تمل کے لیے یہ اعزاز حاصل کیا جو تامل شاعری کو ایک عرصے سے نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ''کالین جر ایوارڈ'' (Kalaiger Award)'' کا لیمامنی

ایوارڈ''(Kalaimamani Award)''بھارتی داسن ایوارڈ'' (Bharathidasan Award)،''کمبر ایوارڈ''(Kamber Award)،''عمر پلور ایوارڈ''(Umaru Pulavar Award) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ کی نظم ''بارکولے ناڈو''(Barkulle Nadhu) میں سماجی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے کہ جیل میں رہنے والے قیدیوں کے بارے میں لکھی گئی تھی اس نظم میں جو لوگ بھوک کی تاب نہ لاکر چھوٹی چھوٹی چوریاں کرتے ہیں تو انھیں فوراً گرفتار کر دیتے ہیں اور انھیں مجرم قرار دیتے ہیں حالانکہ بڑے بڑے چور، غنڈہ گردی اور ڈکیتی کرنے والے باہر آزادانہ طور پر گھومتے ہیں۔ اس بات کو آپ نے بڑے حساس طریقے سے اس نظم میں قلم بند کیا ہے۔

تامل ادب کی مشہور شخصیت ''کناداسن''(Kannadasan) کا قول ہے کہ :

> '' میں جب بھی خلیل جبران کو پڑھتا ہوں تو تڑپ اٹھتا ہوں کہ تمل ادب میں اس طرح کا لکھنے والا کوئی نہیں ہے لیکن وہ پرانی یادیں اور باتیں اب دور ہو چکی ہیں کیونکہ وہ خلا پر کرنے کے لیے عبدالرحمٰن آ گئے ہیں'' ۔

وہ روایتی شاعری کو بہترین انداز میں پیش کرتے تھے اور تمل شاعری میں ہائیکو، غزل اور قوالی جیسی مہارت کے ساتھ لکھ سکتے تھے۔ تمل شاعری میں جنھوں نے 'غزل' کی شکل متعارف کروائی وہ پہلے شخص آپ تھے جنھوں نے نظمی شاعری کے لیے اسٹیج لیا تھا۔ ہندی اور اردو موسیقی کی بحروں (شکلوں) کو تامل میں متعارف کرایا۔ اردو کی عشقیہ شاعری کی غزل کو تمل شاعری میں تشکیل دی۔ شاعری کی ان کتابوں کے علاوہ آپ کی دو تحقیقی کتابیں ادبی مضامین کی دس سے زائد کتابیں اور مضامین کی کئی جلدیں بھی شائع ہو چکی ہیں، جن میں آپ نے دوسری زبانوں سے بھی تمل ادب میں ترجمہ کیا ہے۔ محبت ،فطرت، سیاست، معاشرہ، سائنس ،روحانیت وغیرہ کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر آپ نے قلم نہ اٹھایا ہو۔۔۔ان کی تحریروں میں فکر انگیزی، گہرے جذبات، خالص احساسات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ نہ صرف تحریریں بلکہ آپ کی تقریریں بھی بڑی پر اثر ہوتی ہیں۔ کئی ایسے موضوع ہیں جس پر وہ گھنٹوں بلا جھجک بات کر سکتے تھے ،جو کہ سامعین کو محظوظ کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں'' شاعری نے مجھے منتخب کیا، میں شاعر کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا''۔ آپ نہ صرف تمل زبان بلکہ انگریزی، عربی، اردو، فارسی اور ہندی وغیرہ زبانوں میں بھی عبور رکھتے تھے۔

آپ کی شاعری کا خاص وصف پر کشش الفاظ اور مٹھاس فطری طور پر ظاہر ہوتی ہے، جو پڑھنے والے کے دل پر بہت اثر کرتی ہے اور آپ کی نثر بھی ایک منفرد انداز لیے ہوئے ہے جس میں تخلیقی صلاحیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ساتھ ساتھ آپ کے انداز بیان میں تجسس بھی پایا جاتا ہے۔ بہت سی شخصیتوں نے آپ کو فلموں میں گانے لکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی لیکن وہ اس کوچہ سے دور ہی رہے وجہ یہ ہے کہ آپ وہاں پر آزادانہ طور پر نہیں لکھ سکتے تھے۔ آپ کی شاعرانہ صلاحیتیں شروع ہی سے پروان چڑھی ہوئی تھیں۔ آپ کی نظمیں ادبی انجمنوں کی ریڈیو نشریات اور سماجی و سیاسی تنظیموں کے زیر اہتمام شعراء کی محفلوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچے۔ آپ نے خوبصورت رومانوی ادب تخلیق کیا۔ عبدالرحمٰن صاحب کا عقیدہ تھا کہ اس زمانے کے زندہ ماحول کی وجہ سے زندگی کے احساسات اور مسائل کے اظہار کے لیے نئی شاعری مناسب شکل ہے۔

تمل ناڈو وقف بورڈ کے بطور چیئرمین 2009 سے 2011 تک آپ نے کام کیا۔ جب قضا سامنے کھڑی تو زندگی مسکرا کر لبیک کہہ پڑی ،2 جون 2017 کو آپ 80 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ آپ کی تمل ادب سے وابستگی اور سماجی ترقی میں دلچسپی کا مشاہدہ ان کی کتابوں میں کیا جاسکتا ہے۔ آپ کو تمل ادب کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تامل زبان سے رغبت رکھنے والے پسندیدہ شاعر عبدالرحمٰن کا نام تامل ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حوالہ جات:

1 تامل یلاکیتّل اسلامیر آرٹیہ تونڈو(Tamil Elakiyatthil Islamiyar Artiya Tondhu)، ص نمبر:76
2 تامل یلاکیت تگاول کالن جیم(Tamil Illakiyath Tagaval Kalanjiyam)، ص نمبر:349
3 مدراس ریوؤ ، (Madras Review, Arasiyal Telivu koll)

□□□

S.G.Anisa Begum
Assistant Professor
Department of Urdu
Islamiah Women's Arts & Science College
Vaniyambadi- 635751 (Tamilnadu)

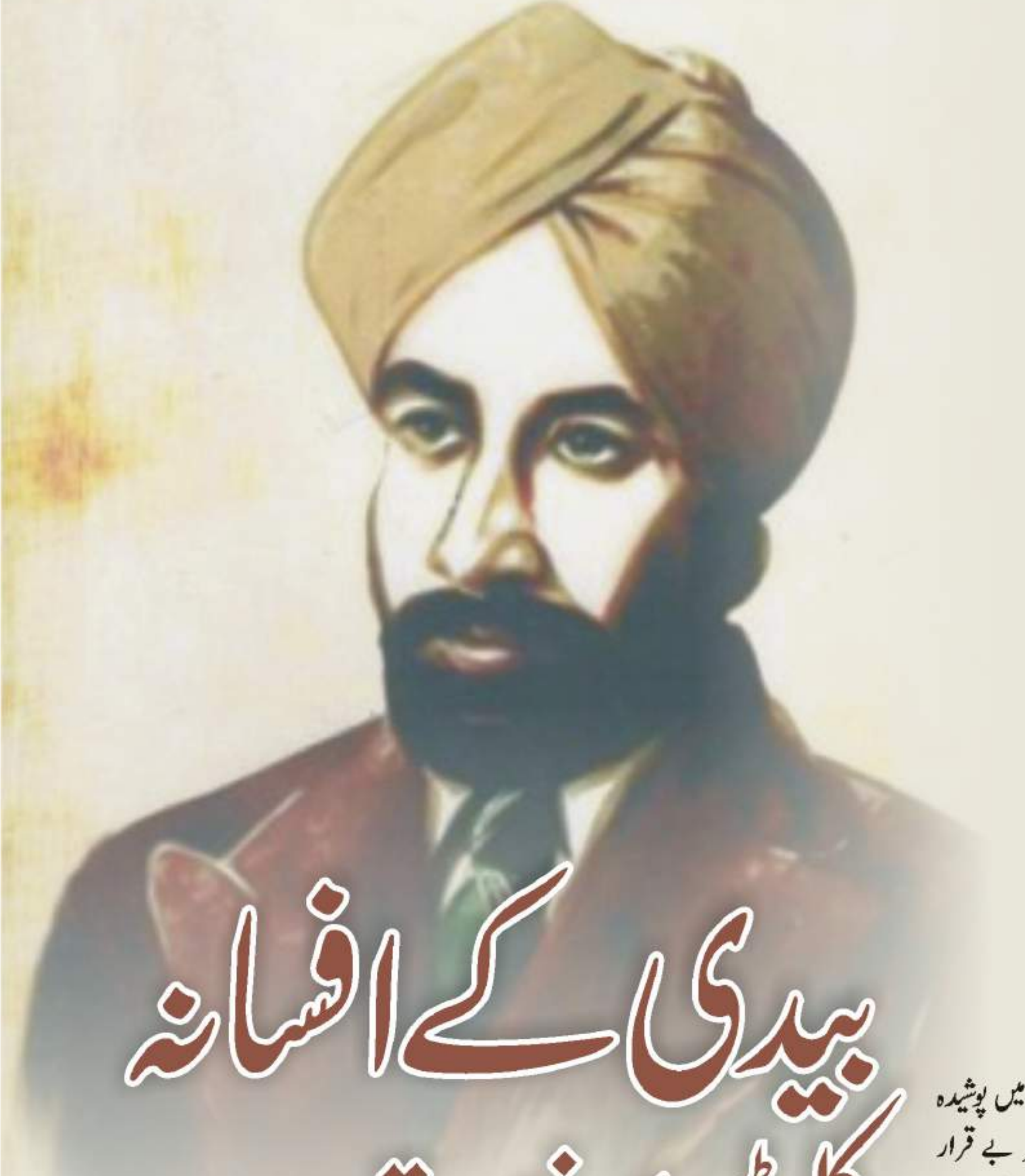

بیدی کے افسانہ یوکلپٹس کا نفسیاتی جائزہ

شاکرہ ضمیر

لاشعور کے نہاں خانوں میں پوشیدہ اور شعور تک رسائی کی خاطر بے قرار احساسات، جذبات اور حادثات کا بالواسطہ یا بلاواسطہ رشتہ انسان کے غیر معمولی حرکات و سکنات سے جوڑنا تحلیل نفسی کہلاتا ہے۔ تحلیل نفسی کی بنیاد اولاً بریر(Breuer) نے رکھی اور سگمنڈ فرائڈ نے اس نظریئے کو استقامت بخشی۔ انسانی ذہن کے مختلف حصوں میں جنھیں شعور، لاشعور اور قبل از شعور کہا جاتا ہے، انسان کی انفرادیت نشوونما پاتی ہے اور فرد کے حرکات وسکنات پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ادب کا ایک اٹوٹ حصہ جسے افسانہ کہا جاتا ہے ادب کی ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو اسے سماج اور فرد کا آئینہ بناتی ہیں۔ ادب کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک خصوصی پہلو نفسیات ہے۔ یقینی طور پر اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بارے میں احتشام حسین اپنے ایک مضمون ''افسانہ میں نفسیات کا عنصر'' میں لکھتے ہیں:

''تخلیقی اور تخیلی ادب میں نفسیات کا عمل حیرت خیز شکل میں داخل ہوتا ہے۔ ایک طرف ادب میں خود ادیب کی نفسیاتی زندگی اور طبعی رجحان کا داخل ہوجانا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری طرف لکھنے والا اپنے کرداروں کی نفسیات سے کام لے کر اپنے مقصد کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

(''نفسیاتی زاویہ نظر اور ادب''، صفحہ نمبر 269، مرتب تہذیب صدیقی، براؤن بک پبلشرز نئی دہلی)

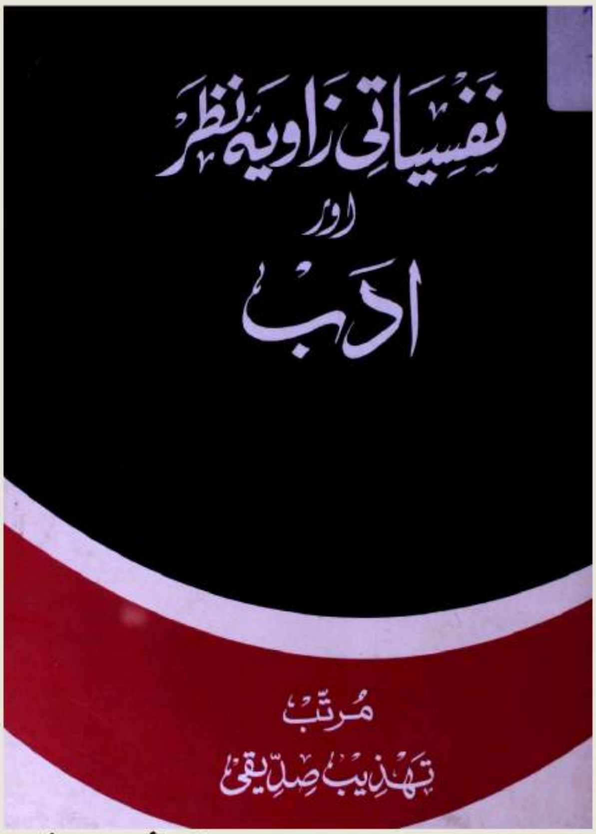

جہاں تک کرداروں کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے عمل کا تعلق ہے ادیب اس عمل میں چوک جائے تو یہ افسانہ نگاری کے عمل میں چوک جانے کے برابر ہے۔ اس عمل میں کامیابی تب تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کرداروں کی نفسیات کے تہہ خانوں کو نہ ٹٹولا جائے۔

کامیاب افسانے اور افسانہ نگار کردار کے اندرون میں نہ صرف جھانکتے ہیں بلکہ وہاں رہائش پذیر ہوکر وہاں کے نشیب و فراز کو جانچتے ہیں۔ ایک کامیاب کردار کے منہ سے نکلا کوئی فقرہ اور بدن سے ہوئی کوئی حرکت بے بنیاد نہیں ہوتی بلکہ افسانے کی ہر کڑی سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔

اُردو افسانے سے ایسے کئی کامیاب کردار اردو ادب کی نذر ہوئے ہیں جو آج بھی زندہ و جاوید معلوم ہوتے ہیں اور اس کی واحد وجہ افسانہ نگار کے کردار کی نفسیات سے واقف ہونا ہے۔ انہی افسانوں میں ایک افسانہ یوکلپٹس ہے۔ یہ افسانہ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی مجموعے "اپنے دُکھ مجھے دے دو" میں شامل ہے۔ افسانہ یوکلپٹس تین محرک اور تہہ دار کرداروں کی نفسیاتی الجھن کی تین مختلف تصویریں پیش کرتا ہے۔ اس افسانے کی خصوصیت اس عمل میں پنہاں ہے کہ کرداروں کے مابین تضاد ہر کردار کی ذہنی تہوں کو مزید روشن کردیتا ہے۔ افسانے میں کرداروں کے درمیان تعلق چاہے محبت اور رواداری کا ہو یا نفرت اور تضاد کا، افسانے کے بین السطور میں ہر طرح کے تعلقات کے ردعمل کی طرف بیدی نے اشارہ کیا ہے۔ افسانے میں جہاں عمومی نفسیات کا انبار بھرا پڑا ہے وہی فرائڈ کے نظریئے کی تائید بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ بیدی نے فرائڈ کے نظریئے جنس کے مطابق کرداروں کے بیشتر اعمال کو جنس کے (Repression) دباؤ کے تعبیر کیا ہے۔ افسانے میں لکشمی (لکھی) جیسے جنس زدہ کردار بھی موجود ہیں اور سہاشنی اور فادر فشر جیسے کردار بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جو جو جنسی خواہشات کو دبائے رکھنے اور انہیں (Taboo) سمجھنے میں یقین رکھتے ہیں۔ فادر فشر جہاں مذہبی (repression) دباؤ سے زیر اثر جنس سے دوری اختیار کرتا ہے وہی سہاشنی ذاتی تجربات کے باعث اعمال و خواہشات سے دوری اختیار کرتی ہے۔ اسی دباؤ کو فرائڈ نے abnormalities کا محرک قرار دیا ہے۔ سگمنڈ فرائڈ کے مطابق جنسی دباؤ انسان کے اندر نفسیاتی الجھن پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سہاشنی اور فادر فشر اس الجھن سے بری نہیں ہیں۔ اپنے ایک مضمون Civilized sexual morality and modern nervousness (1908) میں سگمنڈ فرائڈ رقمطراز ہیں:

> "Sexual repression caused by a morality that restrains sex to marriage and procriation is the source of neurotic illness"2

(Civilized sexual morality and modern nervousness (1908), Sigmund Freud.)

غور طلب ہے کہ یہاں neurotic illness سے مراد نفسیاتی بیماری ہے۔ یہ دونوں کردار جنسی اعمال سے یا تو ایک تلخ تجربے کے ساتھ فارغ ہوچکے ہیں یا اس عمل کو اپنے لیے گناہ تصور کرتے ہیں تاہم دونوں کے جنسی الجھاؤ abnormalities کی صورت میں لاشعور سے شعور تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ سہاشنی کا جہاں تک تعلق ہے وہ مرد ذات سے نفرت کرنے لگتی ہے اور بچے جننے کے عمل کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ افسانے میں وہ لکشمی سے کہتی ہے کہ "سب مرد ایک رسی سے بھاشی دیے جانے کے قابل ہیں۔

فادر فشر جنس سے دور بھاگتے ہیں کیونکہ مذہب نے ان کے ہاتھوں میں بیڑیاں باندھ رکھی ہیں۔ کندن کئی دفعہ فادر فشر کو شادی کے لیے رضامند کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ ہر بار بات ٹال جاتے ہیں۔

افسانے کے بین السطور سے ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ فادر فشر کے

اندر ایک جاندار مرد زندہ ہے جو جنسی اعمال اور شادی شدہ زندگی کی چاہت رکھتا ہے مگر اس دباؤ کے باعث فادر فشر دو کشتیوں میں سوار نظر آتے ہیں۔ کندن سے جنسی رشتہ ہونے کے باوجود وہ حقیقت سے انکار کرتے دکھائی دیتے ہیں گویا یہ سب کچھ خواب میں پیش آیا ہو اور حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ delusion فادر فشر کے جنسی دباؤ یا sexual repression کا نتیجہ ہے۔

کندن اور فادر فشر کے آپسی تعلقات کو وہاب اشرف افسانے کے over estimation سے تعبیر کرتے ہیں تاہم اس نظریئے کا ثبوت ہمیں افسانے میں فادر فشر اور کندن کی بات چیت سے کئی دفعہ ملتا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''کندن جذبات سے معمور ہوگئی۔ ''باب'' اس نے کہا تم ایسا سمجھتے ہو تو کیوں نہیں یہ مشن چھوڑ دیتے، کیوں نہیں شادی''
''باب فشر نے کندن کو وہی روک دیا اور صرف اتنا کہہ دیا۔۔۔نہیں''

(''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ص223، راجندر سنگھ بیدؔی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی)

اس بارے میں وہاب اشرف اپنی تصنیف ''راجندر سنگھ بیدی کو افسانہ نگاری ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی روشنی میں لکھتے ہیں:

''بیدی نے بڑے خاموش انداز سے باب فشر کی زندگی کے سامنے ایک سوالیہ نشان کھینچ دیا ہے۔ کیا وہ واقعی پارسا ہے؟ کیا واقعی اس نے اپنے شہوانی جذبات پر مکمل فتح حاصل کر لی ہے؟ کیا کندن بغیر شادی کے رہ سکتی ہے؟ کیا ایک عمر گزارنے کے باوجود وہ سیتا کی طرح پاک دامن ہے۔

(''راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری''، پروفیسر وہاب اشرفی، ص 70، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

افسانے میں ایسے کئی مواقع پیش آتے ہیں جہاں وہاب اشرف کے بقول over estimation کا قاری کو سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ کہانی ادھورے پن سے بچ جائے اور اس میں ایسے میں واقع آتے ہیں جہاں اکثر قاری over estimate کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ سبھاشنی کا کردار نہایت رازدار کردار ہے۔ سبھاشنی کے بطن سے کندن نے تب جنم لیا جب اس کو باپ کا نام دینے والا کوئی نہ تھا اور کئی بار سبھاشنی اس پلیگ کا ذکر کرتی ہے جس نے کندن کے باپ کو مار دیا کچھ یوں کرتی ہے جیسے کہ اس پلیگ کی کوئی حقیقت نہ ہو بلکہ غور سے پڑھنے پر یہ لفظ ''پلیگ'' سبھاشنی کی اس شخص کے لیے بددعا معلوم ہوتی ہے جو اسے بچے کی ماں بنا کر اکیلا

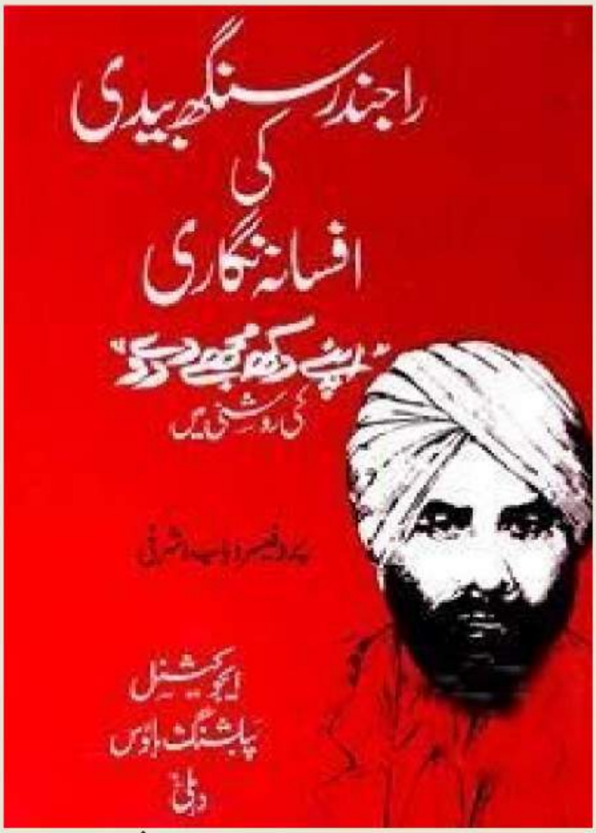

چھوڑ گیا۔ علاوہ ازیں افسانہ نگار کہتا ہے کہ بقول سبھاشنی کندن کا باپ کندن کے پیدا ہونے سے پہلے ہی گزر گیا۔ لفظ ''بقول'' سبھاشنی کے اس بیان پر سوالیہ نشان کھڑا کرتا ہے۔ کندن کے ناجائز ہونے کا ایک اور ثبوت افسانے میں تب ملتا ہے جب سبھاشنی لکشمی سے جو ہر سال ایک بچہ پیدا کرتی ہے اس کے بچے کے باپ کا نام پوچھتی ہے تو کندن کے ردعمل اور سبھاشنی کی بوکھلاہٹ سے کئی حقیقتیں بغیر کہے قاری پر واضح ہو جاتی ہیں۔ کندن سبھاشنی سے لکشمی کے اس بچے کے باپ کا نام طلب کرنے پر سبھاشنی سے کہتی ہے۔

''تم یہ تو مت پوچھو ماں''

(''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ص232، راجندر سنگھ بیدؔی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی)

گویا وہ سبھاشنی کو اس کے اعمال کی یاد دلا رہی ہو اور سبھاشنی کا ردعمل کچھ یوں ہوتا ہے۔

''ماں ایکا ایکی ڈر گئی، اس نے بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ مطلب ڈھونڈنے کی کوشش کی''

(''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ص232، راجندر سنگھ بیدؔی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی)

افسانے کے بین السطور میں جھانکنے پر ایک اور over estimation سامنے آتا ہے۔ جس کے تحت یوکلپٹس کا پیڑ محض لمحوں

کے ڈھیر سے پیدا ہونے والی یادوں کی علامت نہ رہ کر کندن اور فادر فشر کی اولاد کا مدفن ہے۔ فادر فشر اور کندن کا اس پیڑ کے قریب وقتاً فوقتاً پایا جانا اس بات کا اشارہ مانا جاسکتا ہے۔ یہی ہے کہ کندن لکشمی کے بچے کی موت کے بعد یوکلپٹس کا ایک بوٹا اس کی قبر کے پاس لگا دینے کو کہتی ہے۔ افسانے کی اس تعبیر کو تقویت سہاشنی کے ردعمل سے ملتی ہے۔ وہ ایسے چونک اٹھتی ہے جیسے یہ عمل پہلے بھی وجود میں آیا ہو اور ماں بیٹی دونوں نے اس کی یاد کو کہیں ذہن کے کسی کونے میں دفنایا ہو۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''یہ اس پر لگا دو ماں'' وہ بولی۔ ماں نے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کھرپی گر گئی۔ اس نے ایک تیز سی نظر سے سرجو یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف دیکھا اور پھر ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں میں ایک جست کے ساتھ اپنی بیٹی سے لپٹ گئی۔ ماں بیٹی دونوں ایک مشترک غم میں رو رہی تھی۔

(''اپنے دکھ مجھے دے دو''، صفحہ نمبر 233، راجندر سنگھ بیدی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی)

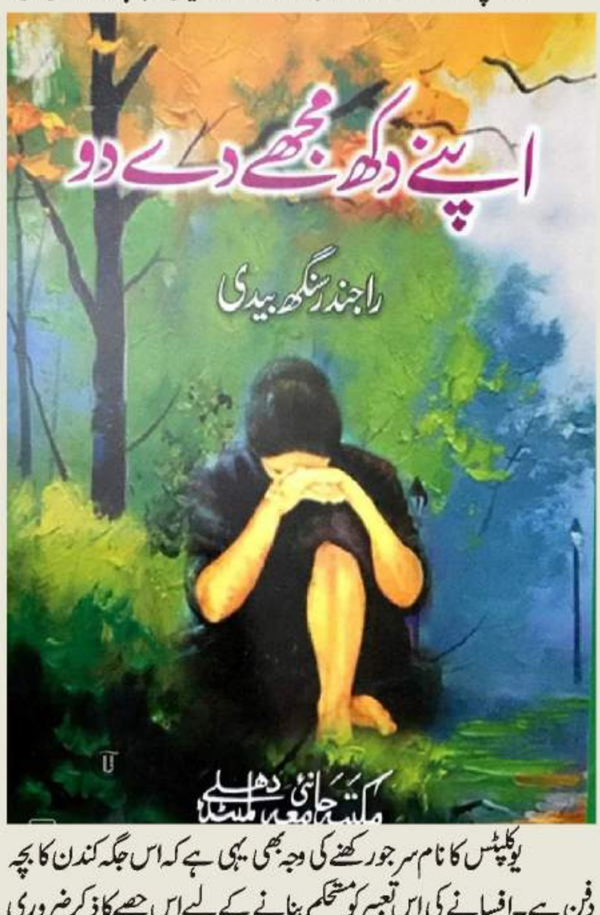

یوکلپٹس کا نام سرجو رکھنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس جگہ کندن کا بچہ دفن ہے۔ افسانے کی اس تعبیر کو مستحکم بنانے کے لیے اس حصے کا ذکر ضروری ہے جب سہاشنی کندن کو سب کچھ بھول کر آگے بڑھنے کو کہتی ہے گویا وہ اسی حادثے کی طرف اشارہ کر رہی ہو اور یہی وجہ ہے کہ کندن لکشمی سے سہاشنی کے مقابلے میں زیادہ ہمدردی رکھتی ہے۔

افسانے میں کندن بیدی کے مطابق Oedipus Complex کی شکار ہے۔ افسانہ نگار نے اس بات کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ باپ کی غیر موجودگی کے باعث کندن ہر مرد سے محبت کی توقع رکھتی تھی۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''وہ اسے (باپ کو) ڈھونڈنے کے سلسلے میں قریب کے کسی بھی مرد پر عاشق ہو جاتی چاہے وہ کیتھولک چیلن ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کیتھولک پجاری کبھی شادی نہیں کر سکتے''۔

(''اپنے دکھ مجھے دے دو''، صفحہ نمبر 225، راجندر سنگھ بیدی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی)

اس اقتباس میں عورت کے تینوں کردار فرائڈ کے Super Ego,ID کے نظریئے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ فرائڈ کے مطابق ہر شخص کے ذہن میں یہ تینوں صورتیں موجود ہیں لیکن کوئی ایک صورت غالب ہو جائے تو انسان کا کردار اور اس کے اعمال اسی کے تحت کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ افسانے میں لکشمی (لکھی) کی بے راہ روی ID کی مغلوبیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہی سہاشنی پر Super Ego یعنی فوق الانا غالب نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں کندن پر Ego یعنی انا حاوی نظر آتی ہے جو اسے حقیقت میں متوازن صورت کو برقرار رکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ بات تب واضح ہو جاتی ہے جب وہ فادر شاہ سے کہتی ہے کہ انسان مذہبی کام کے ساتھ دنیاوی زندگی بھی بہ آسانی گزار سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں کتابوں میں مرد عورت کے بغیر جیسے سوال کا جواب ڈھونڈھتی ہے وہیں اصلیت میں عورت مرد کے بغیر جیسے استفہامی قول کا حل ڈھونڈتی ہے۔ گویا وہ یقین رکھتی ہے کہ دونوں ہی کا ہونا ایک دوسرے کے لیے یکساں اور لازمی ہے۔ افسانے کے آخر تک قاری پر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کندن کے اندر کی عورت اب تک توانا ہے اور شادی کیلئے اب بھی راضی ہے۔

□□□

Shakira Zameer
Phd. Research Scholar
Kashmir University
H. No. 68, Housing Colony
Thanapura, Land Mark Gulshan Park
Srinagar-190015 (Jammu & Kashmir)

شاعرات کے منتخب اشعار

بیٹا الٰہی بخش کے گھر میں ہوا
تہذیب نے دی آ کے نوید دل خواہ

تاریخ دعا یہ اب اس کی لکھ دے
دے اس کی حیات کی ترقی اللہ

سیدہ

کھل گیا راز نہاں پیتے ہی اک ساغر عشق
اب شرف لے گئے غافل ترے شہپاروں پر

عرصہ محشر میں اس کا قرب بھی مل جائے گا
اپنی جا ہم ڈھونڈ لیں گے صاحب محفل کے پاس

امیر بخش امیر

لو اور وہ تو جلنے لگا میرے نام سے
دل اپنا سرد آہ شرر ربا نے کیا

کھلتا نہ تابہ مرگ مرا یہ معاملہ
رسوائے شہر مجھ کو دل زار نے کیا

امیر النساء غریب

سچ دگر کے سب دھن و دولت
جو کچھ ہے سب کھوتے جاویں

روشن کتنا سنیں کہانی
چلو بہن اب سوتے جاویں

بی بی روشن

رات تمھاری یاد جو آئی
رک نہ سکے اشکوں کے دھارے

رونے والے ایک ہمیں تھے
ہم ہی تھے تقدیر کے مارے

نکہت بھاگلپوری

میں جس کے دھیان میں پہروں اداس رہتی ہوں
خیال دل میں میرا لمحہ بھر نہیں لاتا

رکھا ہے آندھیوں نے ہی ہم کو کشید پر
ہم وہ چراغ ہیں جنھیں نسبت ہوا سے ہے

پروین شاکر

مجھے گفتگو کا ہنر نہیں، میری خاموشی میں کمال دے
مرے فن کا رخ ہے دھواں دھواں اسے فکر کے خد و خال دے

میں خیال کہنہ کے پیرہن کو، نئی تراش خراش دوں
لغت جدید کے ذیل میں کوئی دے تو میری مثال دے

صبیحہ صبا

سبز شاخوں پہ سیہ رات اتر آئی ہے
ایک تصویر اندھیرے سے اتر آئی ہے

چاند جب بھی مرے آنگن میں اگا ایسا لگا
اس کی آنکھوں کی کشش اور نکھر آئی ہے

فاطمہ حسن

(ماخذ: شاعرات بہار اور ان کی شعری خدمات: ڈاکٹر محمد شہاب الدین، صائمہ پبلی کیشنز، دریاپور، پٹنہ (بہار) 2015)

ڈاکٹر روبینہ

سائنس میں مسلم خواتین

زمانہ قدیم ہی سے سائنس میں خواتین کا نمایاں کردار اور اس میدان میں ان کی نہایت وقیع خدمات رہی ہیں۔اس میدان میں خدمات انجام دینے کے دوران خواتین کو کئی مشکلات کا سامنا رہا۔اٹھارویں صدی میں جہاں خواتین کو مواقع میسر نہیں تھے لیکن اس کے باوجود بھی خواتین نے سائنس کے میدان میں بہت زیادہ پیش رفت کی۔19ویں صدی میں بھی خواتین کو کئی مشکلات درپیش تھیں وہ رسمی سائنسی تعلیم سے دور تھیں لیکن اس عرصے میں وہ تعلیم یافتہ سوسائٹیوں کا حصہ بننے لگی تھیں۔ 19ویں صدی کے اواخر میں خواتین کے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے رجحان میں اضافہ ہوا اور یوں خواتین سائنس دانوں کو ملازمتیں اور تدریس کے مواقع میسر آئے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے خواتین کا تعلق کافی قدیم ہے اور اس میں مسلم خواتین سائنسدان قابل ذکر ہیں جن میں سے دو مسلم خواتین سائنسدان کا ذکر درج ذیل ہے۔

ڈاکٹر حمیدہ سید وظفر: ماہر امراض چشم

ڈاکٹر حمیدہ کون تھیں؟ اگرچہ ان کی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات پبلک ڈومین میں موجود ہیں لیکن ان کی زندگی کے بنیادی حقائق سے متعلق کافی مواد موجود ہے۔دستیاب ذرائع میں سے ایک نامکمل سوانح عمری ہے جو انھوں نے اپنے پیچھے چھوڑی اور جوان کی بے وقت موت کے بعد محترمہ شیلا حیدر کی کوششوں سے ایک کتاب کی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔

ڈاکٹر (مس) حمیدہ سید وظفر 16 جولائی 1921 کو نینی تال، اتر پردیش میں پیدا ہوئیں۔وہ معروف فزیشن ڈاکٹر سید وظفر خان اور شوکت آرا بیگم کی بیٹی تھیں۔ ان کے والد لکھنؤ میڈیکل کالج میں اناٹومی کے پروفیسر تھے۔حمیدہ سید وظفر نےOphthalmologyMBBS،MS)) اور DCMS کیا۔اس کے علاوہ انھوں نے لندن یونیورسٹی کے مورفیلڈ

آئی ہسپتال سے پی ایچ ڈی (آنکھوں کی سائنس) کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے کولمبو پلان کے تحت 62-1960 کے دوران گلوکوما ریسرچ یونٹ، انسٹی ٹیوٹ آف آپتھلمولوجی، لندن یونیورسٹی سے جدید ترین تربیت اور تجربہ حاصل کیا۔ انھوں نے 1949 سے انسٹی ٹیوٹ آف آپتھلمولوجی، گاندھی آئی ہسپتال، علی گڑھ میں آپتھلمک سرجن کے طور پر خدمات انجام دیں۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 81-1978 میں انسٹی ٹیوٹ آف آپتھلمولوجی کی ڈائریکٹر اور پروفیسر کے طور پر مقرر ہوئیں۔ انھوں نے 1983 میں ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریٹس کے طور پر خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر حمیدہ ایک انتہائی معزز ماہر امراض چشم تھیں۔ ہندوستان سے فارغ التحصیل ہونے والی ابتدائی خواتین ڈاکٹروں میں سے ایک ہیں، ایسے دور میں جب خواتین کو گھر میں رہنا، اور خاندان اور گھر کا انتظام کرنا نصیب ہوتا تھا۔ یہاں وہ لکھنؤ کے کنگ جارج میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس مکمل کرنے والی پہلی طالبہ تھیں اور اس کے بعد میڈیکل پریکٹس کی دنیا اپنی پیشہ ورانہ ساکھ قائم کرنے کے بعد بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک گاندھی آئی ہاسپٹل میں امراض چشم کی پروفیسر بن گئیں۔ وہ رائل سوسائٹی آف میڈیسن، لندن کی فیلو تھیں۔ وہ برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن کی ممبر، ممبر آف تھلمولوجیکل سوسائٹی آف یو کے، ممبر آل انڈیا آپتھلمولوجیکل سوسائٹی، ممبر نیشنل سوسائٹی فار پریوینشن آف بلائنڈنس، ممبر اتر پردیش اسٹیٹ آپتھلمولوجیکل سوسائٹی، ممبر آف انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن اور ممبر ایشیا پیسیفک اکیڈمی آف آپتھلمولوجی نئی دہلی 1985 کے طور پر کئی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں سرگرم رہیں۔

ڈاکٹر حمیدہ سید وظفر امراض چشم کے شعبے میں ایک نامور استاد اور معالج تھیں۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھی: حمیدہ سید وظفر خان (1988-1921)، جسے لولا چٹرجی نے ایڈٹ کیا اور 1996 میں شائع ہوئی۔ اپنی کتاب میں انھوں نے مرد کے تسلط والے معاشرے میں خواتین کے خلاف سماجی و اقتصادی حالات اور تعصب کا ذکر کیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ علی گڑھ میڈیکل کالج کے پڑھے لکھے پروفیسروں میں بھی تعصب غالب تھا۔ فیکلٹی کا خیال تھا کہ خواتین ڈاکٹروں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جانی چاہیے کیونکہ وہ جلد ہی شادی کے بعد یہ پیشہ چھوڑ دیں گی۔ عام طور پر خواتین ڈاکٹروں کو ان کی اعلیٰ مہارت کے لیے گائنا کالوجی میں لے جایا جاتا تھا۔ دوسرے محکموں میں ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی اور وہ قابل قبول نہیں تھے۔ جب حمیدہ نے (OphthalmologyMS) کورس میں داخلہ لیا تو فیکلٹی کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھیوں کی طرف سے کافی مزاحمت ہوئی۔ انھوں نے اتر پردیش میں اندھے پن اور گلوکوما کی روک تھام پر وسیع تحقیقی کام کیا۔ انھوں نے اپنی تحقیق کو آنکھ کے پرتوں کی لچکدار خصوصیات اور آنکھ کے اندرونی دباؤ سے آنکھ کی سختی کے تعلق پر مرکوز کیا۔ انھوں نے آنکھوں کے Duane's retraction syndrome کے مختلف قسم پر اہم تحقیقی کام کیا۔ ڈاکٹر حمیدہ نے اندھے پن کی روک تھام کو فروغ دینے کے لیے دیہی علاقوں میں کئی ورکشاپس اور کیمپس کا انعقاد کیا۔ انھوں نے چھوٹے دیہی کلینکوں میں گلوکوما اور اس کے استعمال کا جراحی علاج کروایا، جہاں بجلی کا سامان دستیاب نہیں تھا۔ انھیں ٹرافی برائے چشم خدمات، 1956 سے نوازا گیا۔ ہیورڈ ریسرچ فیلو برائے گلوکوما ریسرچ، لندن، 70-1967 اور ممتاز خاتون ایوارڈ، بنارس ہندو یونیورسٹی، 1982 سے بھی نوازا گیا۔ ڈاکٹر حمیدہ نے 1987 میں نابینا پن اور گلوکوما کی روک تھام کے بارے میں ڈبلیو ایچ او کے مشیر کے طور پر کام کیا۔ انھوں نے وسیع تر فیلڈ اسٹڈیز کیں اور انتہائی معروف طبی جرائد میں اپنی مہارت کے شعبے میں متعدد مضامین اور رپورٹس شائع کیں جن میں برٹش جرنل آف اوپتھلمولوجی اور امریکن جرنل آف اوپتھلمولوجی شامل ہیں۔

ڈاکٹر حمیدہ فطرت سے محبت کرنے والی تھی۔ 1980 کی دہائی میں جیسے جیسے ماحولیاتی شعور بڑھ رہا تھا، مختلف یونیورسٹیوں میں آرینتھولوجیکل اور وائلڈ لائف اسٹڈیز کے لیے مختص شعبے یا مراکز بنائے جا رہے تھے۔ علی گڑھ میں بھی اس سمت میں منصوبے چل رہے تھے اور ڈاکٹر حمیدہ نے فراخ دلی سے ان کوششوں میں ہر ممکن مدد فراہم کی۔ ڈاکٹر سلیم علی جن کی شہرت اس وقت اپنے عروج پر تھی (وہ بی این ایچ ایس کے ڈائریکٹر تھے، کئی تحقیقی منصوبوں کے پرنسپل انویسٹی گیٹر اور کئی ایوارڈز، پال گیٹی ایوارڈ، پدم وبھوشن وغیرہ کے فاتح تھے) حمیدہ کی دعوت پر علی گڑھ کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے پر انھوں نے پرندوں پر گفتگو کی اور پرندوں کی نقل مکانی پر اپنی فلم کی نمائش کی۔ ان سرگرمیوں نے علی گڑھ میں جنگلی حیات کے محکمے کی تشکیل میں ایک رفتار پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم، بعد میں جب شعبہ شروع ہوا تو حمیدہ کو سائیڈ لائن کر دیا گیا، جس سے انھیں گہرا نقصان پہنچا۔ (اتفاق سے، نئے شعبہ کی تشکیل سے قبل ہونے والی کچھ پیش رفتوں نے اس زمانے میں تہلکہ مچا دیا تھا اور ان کا بہت چرچا ہوا تھا۔ پروفیسر اطہر ایچ صدیقی، جو حیوانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے، اپنی سوانح عمری میں کچھ واقعات کا ذکر کرتے ہیں، "میں کیا میری حیات کیا")۔

ڈاکٹر حمیدہ نے ہمیشہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی اور جو بھی ان کے ساتھ رابطے میں آیا اس کے لیے وہ مددگار اور مہربان تھیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر زویا زیدی جنھوں نے ماسکو میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ علی گڑھ واپس آئی تھیں، وہ حمیدہ کی دلکش شخصیت سے متاثر تھیں، وہ کہتی ہے کہ حمیدہ نوجوانوں کے ساتھ بہت اچھی طرح سے ملتی تھیں شاید اس لیے کیونکہ ان کی پاک روح میں بچوں جیسی معصومیت تھی۔ ڈاکٹر حمیدہ نے شادی نہیں کی، وہ ہمیشہ اپنے پیشہ اور خاندانی حلقوں میں مصروف رہیں۔ ان کا انتقال 1988 میں ہوا۔

پروفیسر قمر رحمان

قمر رحمان ایک ہندوستانی سائنسدان ہیں جنہوں نے نینو پارٹیکلز کے جسمانی اثرات کو سمجھنے کے لیے پچھلے 40 سالوں میں بڑے پیمانے پر کام کیا ہے۔ وہ بین الاقوامی سطح پر ایسبیسٹوسس، سلیٹ ڈسٹ اور دیگر گھریلو اور ماحولیاتی ذرات کی آلودگی کے اثرات اور پیشہ ورانہ صحت کو بہتر بنانے کے ذرائع پر اپنے کام کے لیے جانی جاتی ہے۔ قمر رحمان 1944 میں قصبہ شاہجہاں پور میں پیدا ہوئی۔

سال 1950 میں ایک پرانے معروف پردہ دار خاندان میں 6 سال کی ایک لڑکی (قمر رحمان) اپنی ماں کو گھر میں ایک لیڈی ڈاکٹر کے زیر علاج دیکھتی ہے۔ وہ طبیب سے بہت متاثر ہے۔ وہ ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وقت گزرتا گیا اور ایک دن جب وہ عبداللہ اسکول علی گڑھ میں نویں جماعت میں تھی تو وہ اپنی ماں کے پاس گئیں اور بتایا کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہیں۔ ان کی ماں نے اس خیال کو منظور نہیں کیا۔ جیسا کہ ان کی رائے میں لیڈی ڈاکٹرز اپنے مرد مریضوں کے ساتھ کچھ ایسی باتوں پر تبادلہ خیال کرتی ہیں جو بہت مہذب نہیں ہوتیں۔ جب وہ بی ایس سی میں تھی تو ان کی شادی ہوگئی۔ بدقسمتی سے انھیں اپنی شادی شدہ زندگی میں مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ وہ زندگی نہیں ہے جو وہ چاہتی تھی۔ کسی ایسے شخص کے ساتھ رہنا جو بہت مختلف تھا اور اس کا احترام بھی نہیں کرتا تھا، وہ ایسی چیز تھی جسے وہ قبول نہیں کرتی تھی اور نہ کرسکتی تھیں۔

وہ اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے والدین کے گھر چلی آئی جو چند ماہ کی تھی۔ انھوں نے M.Sc. میں آگرہ کے سینٹ جانس کالج میں فزیکل کیمسٹری میں جہاں ان کے والد کمشنر کے عہدے پر تعینات تھے وہاں داخلہ لیا۔ ایک بچے کے ساتھ پڑھنا کافی مشکل تھا لیکن ان کی ماں نے چھوٹے بچے کے ساتھ ان کی بہت مدد کی اور انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد وہ اپنے والدین کے ساتھ دوبارہ شاہجہاں پور آگئیں۔

ایک دن وہ لکھنؤ میں اپنی بہن سے ملنے گئی اور کرامت حسین مسلم گرلز کالج کی پرنسپل محترمہ وسیم سے ملاقات کی۔ محترمہ وسیم انٹرمیڈیٹ کلاسز کے لیے کیمسٹری کے لیکچرر کی تلاش میں تھیں۔

انھوں نے بحیثیت کیمسٹری کے لیکچرر کالج جوائن کرلیا اور یہ اس کی زندگی کا بہت اچھا تجربہ تھا۔ نوجوان لڑکیوں کو سائنس کی تعلیم دینا، پرکنگ سینئر اور جونیئر جیسے سائنسدانوں کے بارے میں بات کرنا، Kekulé اور Fischer's کے خوابوں پر گفتگو کرنا اس کے لیے فخر کی بات تھی۔ لیکن پھر بھی انھوں بہت کچھ کرنا تھا۔ ایک دن وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ بایو کیمسٹری میں گئی اور پروفیسر پی ایس کرشنن سے ملاقات کی جو ایک مشہور بایو کیمسٹ تھے اور اپنے شعبے کے ایک لیجنڈ تھے۔ قمر رحمان نے ان سے درخواست کی کہ وہ اسے پی ایچ ڈی کے لیے اپنی نگرانی میں لیں۔ پہلے تو وہ نہیں مانے لیکن ان کے عزم کو دیکھ کر انھوں نے قمر رحمان کو ڈیپارٹمنٹ جوائن کرنے کی اجازت دے دی۔ جلد ہی (1970) انڈسٹریل ٹاکسیکولوجی ریسرچ سینٹر نے (سائنسی اور صنعتی تحقیق کی کونسل کی معروف قومی لیبارٹری میں سے ایک) جونیئر سائنٹیفک ریسرچ اسسٹنٹ (JSA) کی پوسٹ کا اشتہار دیا۔ انھوں نے اس کے لیے درخواست دی اور پوزیشن حاصل کی۔ ڈاکٹر اے ایس پینٹل سلیکشن کمیٹی کے چیئر پرسن تھے۔ انھوں نے کہا کہ "تم اس میدان میں اپنا نام پیدا کروگی۔"

اپنے سائنسی سفر میں وہ مختلف تجربات سے گزری۔ انھوں نے

محسوس کیا کہ ہر مرحلے پر عورت کو مرد سے زیادہ محنت کرنی چاہیے۔ مرد کے تسلط والے معاشرے میں عورت کے لیے مقام حاصل کرنا اور نام کمانا بہت مشکل ہے۔ لیکن انھوں نے کبھی ہار قبول نہیں کی اور بہت سی رکاوٹوں کے باوجود خود کو آگے بڑھایا۔ اٹاکسیکولوجی کا انھیں گہرا تجربہ ہے، یہ ایک ایسا شعبہ جس میں وہ وسیع پیمانے پر کام کر رہی ہیں۔ ان کی تحقیق کا بنیادی شعبہ ریشوں، ذرات اور نینو پارٹیکلز وغیرہ پر مبنی ہے۔ اپنے کام کی بنیاد پر انھوں نے بین الاقوامی شہرت کے جرائد میں 130 سے زائد مقالے شائع کیے ہیں۔

انھوں نے سیلیکا، ایسبیسٹوس، ایسبیسٹوس کے متبادل، سلیٹ ڈسٹ، قالین کی دھول، کاجل اور دیگر انتہائی باریک ذرات، معروف ماحولیاتی اور پیشہ ورانہ فضائی آلودگی کے ساتھ کام کیا ہے۔ قمر رحمان نے خطرے کی تشخیص کے تجزیہ کے لیے مالیکیولر لیول پر بائیو مارکر کا استعمال کرتے ہوئے آبادی پر ان آلودگیوں کے اثرات کی نگرانی کے لیے وبائی امراض کے سروے بھی کیے ہیں۔

انھوں نے منظم اور غیر منظم دونوں شعبوں میں ایسبیسٹس پر مبنی صنعتوں میں گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور بیماری کے عمل کو تیز کرنے والے ہندوستانی صنعتوں میں موجود پیش گوئی کرنے والے عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تحقیق میں ثابت ہوا کہ سگریٹ کے دھوئیں اور مٹی کے تیل کا مرکب آبادی میں بیماری کے عمل کو تیز کرتا ہے۔ ہندوستان میں ایسبیسٹس پر مبنی صنعتوں کے مطالعہ نے پیشہ ورانہ طور پر قابل احترام آبادی کو اجاگر کیا۔ یہ نتائج ایسبیسٹس کے بے نقاب کارکنوں کو سگریٹ نوشی سے پرہیز کرنے، غیر پروسیس شدہ کھانا پکانے والے ایندھن کی نمائش سے بچنے کے لیے مشورہ دینے کے لیے بڑی قومی اہمیت کے حامل ہیں۔ فضائی آلودگی اور خواتین کے مسائل پر تحقیقی کام کی بنیاد پر، امریکہ، کامن ویلتھ سائنس کونسل، لندن، جرمنی اور حکومت ہند کی جانب سے مالی اعانت سے بین الاقوامی اور قومی اشتراکی منصوبے شروع کیے گئے۔

ان کی سائنسی کامیابیوں کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا جیسا کہ انھیں بیرون ملک تحقیقی دوروں کی ادائیگی، جائزہ مضامین لکھنے، بین الاقوامی میٹنگز منعقد کرنے کے لیے موصول ہونے والے دعوت ناموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ انھیں بین الاقوامی سطح پر معروف اداروں جیسے کہ نیشنل سینٹر فار ٹوکسیولوجیکل ریسرچ نومبر 1981، کریٹیل یونیورسٹی، پیرس، فرانس، 1987 یو ایس انوائرنمنٹل پروٹیکشن ایجنسی، اور ڈیوک یونیورسٹی، نارتھ کیرولینا، ای پی اے، 94، کے تعاون پر مبنی پروگراموں کے تحت مہمان سائنسدان کے طور پر مدعو کیا گیا ہے۔ یو ایس نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف انوائرنمنٹل ہیلتھ سائنسز، 1996، جرمن فار schungszentrum Karlsruhe، 1994 اور 1996، Institute for Cell Biology and Biosystem Technology University of Rostock، 1998، 1999، 2001، 2002، 2004، 2006، 2007، 2008 انہیں قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں مذاکرے اور کلیدی خطابات دینے کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ سائنس میں ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں اور نوجوان سائنسدانوں کی ترقی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

پروفیسر رحمن کو حال ہی میں حکومت ہند کی اقلیتی وزارت نے سنٹرل وقف کونسل برائے تعلیم کا رکن مقرر کیا تھا۔ ستمبر 2009 میں انھیں روسٹک یونیورسٹی جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ یونیورسٹی کے 600 سالوں میں وہ پہلی ہندوستانی ہیں جنھوں نے یہ اعزاز حاصل کیا اور انھوں نے اس پلیٹ فارم کو آئن اسٹائن جیسے نوبل انعام یافتہ افراد کے ساتھ شیئر کیا۔

حوالہ جات

Chattopadhyay, Anjana(2018.(Women Scientists in India: Lives, Struggles Achievements (PDF.(National Book Trust, India. ISBN 978-81-237-8144-0.

Urfi, Jamil(1May 2020".(Remembering Dr. Hamida Saiduzzafar: A birdwatcher par excellence." Karvaan India. Retrieved 18October 2020.

https//:en.wikipedia.org/wiki/Hamida_Saiduzzafar

https//:www.ias.ac.in/Initiatives/Women_in Science/The_Women_Scientists_of_Inda

https//:en.wikipedia.org/wiki/Qamar_Rahman

http//:www.niehs.nih.gov/

□□□

Dr. Rubeena

H. No 9-4-131/1/N/15,

First Floor, Lane No:4

Neeraja Colony, Tolichowki

Hyderabad-500008 (T.S)

سائنس میں خواتین

آسیہ خان

خلائی افق کا آفتاب ہیں خواتین

15 اگست 2019 کو ہندی فلم مشن منگل کی ریلیز سے قبل شاید ہی کوئی جانتا ہو کہ اس مشن کی کامیابی کا کریڈٹ ان خواتین کو جاتا ہے جنھوں نے ایسی سائنسی مشین کو پایۂ تکمیل پہنچانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ حالانکہ مشن منگل کے ہیرو اکشے کمار تھے لیکن اس فلم میں 5 کردار ایسے تھے جو ہیرو کے کردار پر غالب آ گئے تھے اور یہ کردار ادا کیے تھے ودیا بالن، سوناکشی سنہا، تاپسی پنّو، کیرتی کلہڑی اور نتیا مینن نے۔ ان اداکاروں نے جن کردار کو نبھایا یہی وہ کردار تھے جنھوں نے پوری دنیا میں اس مشن کی کامیابی پر مقبولیت حاصل کی اور ثابت کر دیا کہ سائنس کے میدان میں خواتین کی حصے داری اب بھی برقرار ہے اور صنف نازک کہلائی جانے والی عورت کسی بھی حصے میں مردوں سے کم نہیں۔

آج زندگی کے ہر شعبے میں خواتین ایک اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ آج خلائی سائنس سے لے کر کیمسٹری، فزکس، بایولوجی، مخلوقیات، میڈیکل، نینو تکنیک، جوہری تحقیق، زمین اور ماحولیاتی سائنس، ریاضی انجینئرنگ اور زراعتی سائنس جیسے چیلنجنگ شعبوں میں خواتین کامیابی کے پرچم لہرا رہی ہیں۔ حالانکہ سائنس، تکنیک، انجینئرنگ اور ریاضی کے شعبوں میں ان کی تعداد مردوں کے برابر تو نہیں ہے۔ لیکن ان شعبوں میں ان کی دلچسپی مسلسل بڑھ رہی ہے اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اپنی سماجی اور گھریلو ذمے داریوں کی وجہ سے خواتین کے لیے سائنس کی دنیا میں مقام حاصل کرنا کبھی بھی آسان نہیں رہا ہے۔ کچھ دہائیوں قبل ظاہر ہے حالات اور بھی مشکل تھے۔ جہاں لڑکیوں کا اسکول جانا بھی برا سمجھا جاتا تھا اور انھیں تعلیم سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بھی خواتین نے تمام تر مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے سائنس جیسے شعبے میں اپنی شناخت بنائی اور ایسی مثالیں قائم کیں جنھیں آج دنیا یاد کرتی ہے۔ ایسے میں ان سینئر خواتین سائنس دانوں کا ذکر ضروری ہے جن کی شخصیت آنے والی نسلوں کے لیے ایک نذیر ہے۔ یہاں ہم کچھ ایسی ہی خواتین کا ذکر کر رہے ہیں جن کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور پڑھا جا چکا ہے۔ جیسے انا منی (23 اگست 1918-16 اگست 2001) جنھوں نے 8 سال کی عمر میں تحفہ میں ملنے والے ہیرے کے بُندے ٹھکرا کر انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا (Britinica) مانگ لیا تھا۔ انھوں نے 1930 میں نوبل اعزاز سے سرفراز ہندوستانی سائنس داں سی۔ وی رمن کے ساتھ بہت سے سائنسی پروجیکٹس پر کام کیا اور مختلف سائنسی اداروں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہیں۔

اسیما چٹرجی نے 23 ستمبر 1917 سے 22 نومبر 2006 کو

کیمسٹری کے شعبے میں بہت کام کیا۔ انھوں نے کینسر جیسی کئی موذی امراض کے لیے موثر دوائیاں ایجاد کیں اور دنیا نے ان سے بہت فائدہ اٹھایا۔ مرگی سے لے کر ملیریا جیسی بیماریوں میں ان کے فارمولے پر بنی دوائیں آج بھی لوگوں کو راحت پہنچا رہی ہیں۔

کمل رن دیوے (15 دسمبر 1905 سے 11 اگست 1970) ملک میں کینسر کے علاج کو ممکن بنانے میں انھوں نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے جزام جیسے مرض کے لیے بہت اہم دوائیوں کی ایجاد کرنے میں مدد کی جس کی وجہ سے انھیں ملک کے دوسرے سب سے بڑے اعزاز پدم وبھوشن سے نوازا گیا۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے انڈین ویمن سائنس فیڈریشن کا قیام کرکے فیلڈ میں آنے والی نئی نسل کی خواتین کے لیے نئی رائیں بھی ہموار کیں۔

ای کے جانکی اماں (6 نومبر 1897 سے 7 فروری 1984) جانکی اماں نے گنے کی ایک نہایت میٹھی قسم کی ایجاد کی۔ انھوں نے ایسے گنے کی بھی ایجاد کی جو کئی طرح کی بیماریوں اور قحط کے حالات میں بھی پیدا ہو سکے۔

انھیں صرف ایسی ریسرچ کی وجہ سے ہی نہیں جانا جاتا بلکہ آزادی کے فوراً بعد جو با صلاحیت سائنس داں یہاں سے جانا چاہتے تھے تو انھیں ملک میں روکنے کے لیے اور با صلاحیت شخصیات کی حوصلہ افزائی کے لیے اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کی درخواست پر انھوں نے انڈین بوٹینیکل سوسائٹی کا دوبارہ قیام کیا۔ انھیں 1957 میں پدم شری کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

کملا سوہنی (18 جون 1911 سے 28 جون 1998) کملا سوہنی مشہور سائنس داں پروفیسر سی وی رمن کی پہلی طالب علم تھیں۔ کملا سوہنی پہلی ہندوستانی خاتون سائنس دان بھی ہیں جنھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انھوں نے نوبل اعزاز یافتہ فریڈرک ہاپ کنس کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔

آنندی بائی گوپال راؤ جوشی (31 مارچ 1865 سے 26 فروری 1887) ہندوستان کی پہلی خاتون فزیشن تھیں۔ ان کی شادی محض 9 سال کی عمر میں ہوگئی تھی اور وہ 16 سال کی عمر میں ماں بھی بن گئی تھیں۔ کسی دوائی کی کمی کی وجہ سے بہت ہی کم عمر میں ان کے بیٹے کا انتقال ہو گیا جس کے بعد انھوں نے نئی نئی دوائیوں کی ایجاد کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ انھوں نے پینسل وینیا میڈیکل کالج میں پڑھائی کی تھی۔ اتنی مشکلات کے باوجود ان کا حوصلہ پست نہیں ہوا اور انھوں نے اپنی جدوجہد سے کامیابی کی ایک نئی کہانی لکھی۔

ڈاکٹر درشن رنگا ناتھن (6 جون 1961 سے 6 جون 2001) نے بایوکیمسٹری کے شعبے میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ دلی کے مرانڈا ہاؤس کالج میں پڑھا۔ وہاں سے اسکالرشپ مل گئی تو امریکہ چلی گئیں۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد آئی آئی ٹی کانپور میں ٹیچر سبرامنیم رنگا ناتھن سے شادی تھی۔ وہ سائنس سے متعلق جریدوں کی ایڈیٹر بھی رہیں۔ نیشنل سائنس اکیڈمی کی فیلو بھی رہیں۔ پھر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی حیدرآباد کی ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھلا۔ 2001 میں دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

کلپنا چاولہ: کلپنا اسپیس شٹل Space Shuttle سے خلاء میں جانے والی پہلی ہندوستانی خاتون سائنس داں ہیں۔ 1982 میں امریکہ جاکر ایئر و اسپیس انجینئرنگ ماسٹرز کی ڈگری لینے والی کلپنا نے 1986 میں دوسری ماسٹرز کی ڈگری لی اور پھر 1988 میں ایئر و اسپیس Airo Space انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی مل گئی۔ فروری 2003 کو کولمبیا شٹل ڈیزاسٹر (Columbia Shuttel disaster) میں مارے جانے والے کرو ممبرز میں سے ایک کلپنا چاولہ بھی تھیں۔

اب ہم ذکر کریں گے نئے دور کی ان خواتین سائنسدانوں کا جنھوں نے پوری دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ابھی حال ہی میں ہندوستان نے خلاء میں ایک سیٹلائٹ کا کامیاب تجربہ کیا۔ جس کی تعریف پوری دنیا کے ترقی یافتہ ممالک بھی کر رہے ہیں۔ اس کامیابی کے

پیچھے بھی خواتین سائنسدانوں کا اہم رول رہا ہے اور خواتین نے پھر سے ثابت کر دیا کہ ان کی صلاحیتوں کی کوئی حد نہیں وہ لامحدود ہیں۔ ان خواتین سائنسدانوں میں ریتو کرڑھال کا نام پہلے نمبر پر لیا جا سکتا ہے۔ ایسرو میں آنے والے کئی مسائل کو انھوں نے چٹکیوں میں حل کر دیا ہے۔ دو بچوں کی ں ہیں اس کے باوجود اپنا زیادہ تر وقت ایرو میں ہی گزارتی ہیں وہ منگل ین مشن کی ڈپٹی آپریشن ڈائرکٹر رہیں اور اس مشن کو پورا کرنے والے کامیاب گروپ کی ایک اہم کردار ہیں۔

مومیتا دتا۔ مومیتا دتا نے منگل یان مشن کے لیے بطور پروجیکٹ منیجر کام کیا۔ انھوں نے کولکاتا یونیورسٹی سے ایم۔ ٹیک کیا ہے۔

نندنی ہری ناتھ: نندنی ہری ناتھ اپنی پہلی ملازمت کے طور پر ایسرو میں شامل ہوئی تھیں اور آج 20 سال گزر جانے کے باوجود مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور اس پروجیکٹ کے لیے انھوں نے بہت محنت کی۔

انورادھا ٹی کے: ایسرو میں ایک سینئر عہدے پر فائز ہیں اور دیگر خواتین سائنس دانوں کے لیے ایک آئیڈیل ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں انھیں بجائے رٹنے یا یاد کرنے کے منطقی میکنکس زیادہ پسند تھے آج وہ ایسرو کے اہم ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ ہیں اور اب بھی اسی طرح سوچتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ برابری یہاں برابری کے سلوک کی وجہ سے کئی بار انھیں یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ ایک خاتون ہیں یا کچھ الگ بھی ہیں۔

این ولارمتھی: ولارمتھی نے ہندوستان کے راڈار امیجنگ سیٹلائٹ کی لانچنگ کی قیادت کی ہے۔ ٹی کے انورادھا کے بعد وہ ایسرو کے سیٹلائٹ مشن کی ہیڈ کے طور پر دوسری خاتون افسر ہیں۔ 52 سال کی عمر میں انھوں نے اپنی ریاست تمل ناڈو کے وقار میں اضافہ کیا ہے وہ ریموٹ سینسنگ سیٹلائٹ مشن کی بھی ہیڈ رہی ہیں۔

مینل سمپت Meenal Sampat: مینل سمپت نے ایسرو کے سسٹم انجینئر کے طور پر 500 سائنسدانوں کی قیادت کی ہے۔ مشن منگل میں کامیابی کے بعد اب ان کا دوسرا ٹارگیٹ نیشنل اسپیس انسٹی ٹیوٹ میں پہلی خاتون ڈائرکٹر بننا ہے۔

کیرتی فوجدار: ایرو کی کمپیوٹر سائنس داں ہیں جو سٹیلائٹ کو ان کی صحیح جگہ پر پہنچانے کے لیے ماسٹر کنٹرول فیسیلیٹی پر کام کرتی ہیں۔ کچھ بھی غلط ہونے پر سدھار کا کام وہی کرتی ہیں۔ کیرتی اب بھی پڑھائی کرنا چاہتی ہیں اور مزید بہتر کارکردگی کے لیے ایم ٹیک کرنا چاہتی ہیں۔

ٹیسی تھامس: ٹیسی ہندوستان کی وہ میزائل ویمن ہیں جنھوں نے اگنی 4 اور اگنی 5 مشن میں ا رول دا کیا ہے۔ ٹیسی ڈی آر ڈی او کے لیے تکنیکی کام کرتی ہیں۔ اپنی صلاحیتوں اور کارگزاریوں کی وجہ سے ہی انھیں 'اگنی پتری' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں 6 ہزار سے بھی زائد خواتین ایسرو کے لیے کام کر رہی ہیں۔ حالانکہ ایسرو کے سبھی 7 ڈائرکٹرز مرد سائنس داں ہی رہے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہزاروں خواتین ہمارے خلائی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہونے والی نئی ریسرچوں کے لیے دن رات محنت کر رہی ہیں اور اگر سمت حکومت ہند کے اقدامات کی بات کریں تو خواتین سائنس دانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومت نے ہر خواتین کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ سائنس، ٹکنالوجی، انجینئرنگ اور ریاضی کے مدیان میں کیریر بنانے کے لیے خواتین کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے جس کے تحت 2019 سے 'وگیان جیوتی' نامی ایک اسکیم بھی چلائی جارہی ہے۔ ساتھ ہی خواتین سائنس دانوں کی صلاحیتوں میں مزید نکھار کے لیے 15-2014 میں ایک مہم ''کیرن یوجنا'' کا آغاز بھی کیا گیا ہے۔ جس کے تحت ہزاروں خواتین کی سائنس کے تعلق سے کارگزاریوں میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ وقت کے ساتھ ساتھ خواتین نے سائنس کے میدان میں اپنی محنت اور لگن سے اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔ ہاں ان کی رفتار میں ابھی اتنی تیزی نہیں ہے لیکن ان کے تجربات اور نئی ایجادات نے دنیا کو آگے لے جانے میں بہت مدد دی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بے پناہ صلاحیت کی مالک جو اپنے ذاتی اور گھریلو حالات کے باوجود اتنی محنت کر رہی ہیں ان کو بھرپور تعاون دیا جائے۔ ان کے خاندان، تعلیمی ادارے، کمپنیاں اور حکومتیں سب کو ساتھ مل کر ان کے لیے کام کرنا ہوگا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی۔ ساتھ ہی وہ خواتین جنھوں نے سائنس کی دنیا میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور اپنے تجربات اور ایجادات سے دنیا کو فائدہ پہنچایا ان کی کہانی ٹی وی، میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے سب تک پہنچائی جانی چاہیے۔ تاکہ تنگ ذہنیت والے لوگوں کو بیدار کیا جاسکے اور ملک کی بیٹیاں سائنس کے شعبے میں زیادہ سے زیادہ اپنی حصہ داری کو یقینی بناسکیں۔

□□□

Asiya Khan
1101, Chabuk Sawar
Lal Kuan, Chandni Chowk
Delhi-110006
Mob: 7011800481

نظمیں

ڈاکٹر ہاجرہ خاتون

بیٹیوں کی رخصتی پر

کھنکھنانے والی چوڑیاں
جس دن
چھن سے ٹوٹ جاتی ہیں
ہوا۔۔۔
ہولے ہولے سے
برہ کے گیت گاتی ہے
دور کہیں۔۔۔
سناٹے میں
چڑیا کی آخری آواز
زمیں کا رزق ہوجاتی ہے۔

فنا

غم کے انبوہ تلے
ٹوٹے ٹوٹے
بکھرے بکھرے
ہم انا مزاج لوگ
تمام خوبصورتی سمیت
کرب و نارسائی کی چادر
اوڑھ
خود سے
خود پر بین کرتے ہوئے
مٹی مٹی ہوجاتے ہیں۔

Dr. Hajra Khatoon
1C Zuleikha Enclave,
Parastoli, Doranda,
Ranchi-834002
Mobile no-.9430254770

حسنِ سخن

غزلیں

ڈاکٹر عنبر عابد

برسا کرتی ہیں مری آنکھیں بھی برسات کے ساتھ
مجھ کو جینا ہے مسلسل انھیں حالات کے ساتھ

بیشتر صرف تعلّق کو نبھانے کے لئے
ہنسنا پڑتا ہے ہمیں لاکھ شکایات کے ساتھ

آج محلوں میں بھی رہ کر نہیں رہتے ہم لوگ
جتنے خوش رہتے تھے کل کچّے مکانات کے ساتھ

میں ہوں اجداد کی تہذیب و تمدّن کی امیں
ہے ردا سر پہ مرے ساری روایات کے ساتھ

اب تو ہر لمحہ بدلنے لگا لہجہ تیرا
اب کہاں پہلے سی ہے بات تری بات کے ساتھ

ہم تو یہ سوچ کے ہارا کئے جیتی بازی
ہار جائیں نہ کہیں تجھکو تری مات کے ساتھ

رات دلہن بنی چاند ہے دولہا اس کا
اور ستارے بھی چلے آئے ہیں بارات کے ساتھ

تم رہِ زیست میں تنہا تو نہیں ہو عنبر
خونِ دل، اشکِ رواں بھی تو ہیں صدمات کے ساتھ

Dr.Amber Abid
H.No.14 Near Mohammadi Masjid
Land Mark (Shelter)
Khawaspura Shajahanabad
Bhopal-462001(MP)

میمونہ تحسین

اگرچہ کوئی بھی سائل نہیں تھا
مگر میں اس کے تو قابل نہیں تھا

کہاں ہے اس کی وہ دہلیز جس پر
گزرنے کے کبھی قائل نہیں تھا

وہ کرتے ہیں بحث اس بات پر جو
وہ موضوع جو کبھی حائل نہیں تھا

یہی وہ روشنی ہے جس کی خاطر
سفر کرنے پہ وہ مائل نہیں تھا

اسی محفل میں وہ پہنچا اکیلا
جہاں اس کا گزر زائل نہیں تھا

میں کیسے راہ سیدھی اپنی چلتا
دکھانے راہ بھی کامل نہیں تھا

نہ جانے اشک کتنے ہیں یہ دل پر
انھیں چننے کے میں قائل نہیں تھا

یہ تصویروں میں کیسے رنگ بھر دوں
چہرہ تحسین مکمل نہیں تھا

Maimuna Tahseen
H No. 9-6-692, Bagban Colony,
Near Quba Masjid,
Degloor Naka
Nanded-431604 (Maharashtra)

ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک

رشتوں کی مہک

یہ ان دنوں کی بات ہے جب شہر کل کی طرح بڑے بڑے نہیں ہوتے تھے بھیڑ بھی اتنی نہیں ہوتی تھی لیکن گاؤں اور قصبہ کی زندگی کہیں زیادہ پرسکون تھی۔زیادہ تر لوگ کاشتکار تھے۔

مرادآباد شہر کے لاکڑی والان، مغل پورہ، سید خاں کا گھیر اور فیض گنج علاقہ آپس میں جڑے ہوئے تھے ان علاقوں میں سید، پٹھان و مغلوں کی پرانی بستیاں آباد تھیں ان لوگوں میں تعلیم بھی تھی اور وہ اپنے رواجوں و رسموں کو بھی نبھاتے تھے۔

زمیندار بختیار حسین خود پٹھان تھے اور ان کی بیوی سیدانی تھیں۔ بہت سادہ دل انسان تھے اور زمینداروں کی طرح سخت گیر نہیں تھے ہمیشہ غریبوں کی مدد ایسے کرتے تھے کہ ایک ہاتھ دے تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ پہلے ان کا ایک گاؤں تھا، پرکھوں کے زمانے کا آزادی کے بعد گاؤں تو اپنے نہیں رہے تھے۔ان کی اپنی کچھ زمینیں تھیں، ڈیرا تھا جہاں وہ جا کر ٹھہرتے تھے لیکن ان کے اچھے برتاؤ کی وجہ سے گاؤں کے لوگ ان سے بہت پیار اور عزت کرتے تھے۔

ماں حسن آرا بیگم بڑی بردبار خاتون تھیں وہ سید گھرانے کی تھیں سانولا نمکین رنگ، لمبا قد، بھرا بھرا جسم۔اس زمانے میں اکثر سفید غرارہ اور کفوں والے جمپر پہننے کا رواج تھا وہ بھی وہی پہنتی تھیں جارجٹ کے سفید دوپٹے پر جرمنی، سکیا، یا کوئی سنہری بیل لگی ہوتی تھی ان کی بہو خالدہ خانم گوری چٹی تھیں وہ بھی ساٹن کا غرارہ لیڈی ملٹن کا جمپر، شفون کا لچکا لگا یا کامدانی کا دوپٹہ اوڑھتی تھیں گرمیوں میں دریز، وائل یا سوتی چکن کے دوپٹے اور جمپر ہوتے بڑھیا لٹھے یا پاپلین کے غرارے پہنے جاتے مہندی کا بہت رواج تھا بوڑھی عورتوں کے ہاتھ بھی مہندی سے رچے ہوتے تھے، مہندی لگانا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

اس وقت آج کی طرح رشتوں میں دوریاں نہیں آئی تھیں پاس کے ہی نہیں دور کے رشتے داروں میں بھی میل ملاپ اور آنا جانا رہتا تھا۔ حسن آرا بیگم یا خالدہ خانم کی کوئی نہ کوئی عزیز یا محلے والیاں شام کو ملنے آجاتیں کسی کا بچہ بیمار ہوتا تو تعویز لینے یا دم کا پانی لینے آتی تھیں اللہ کے حکم سے اکثر شفا بھی ہوجاتی تھی۔ حسن آرا بیگم کو سب امی جان کہتے تھے، کوئی خاتون کمزوری یا چکر کی شکایات کرتیں تو کوئی معجون، مربہ یا خمیرہ۔ بدہضمی کے لیے چورن وغیرہ دے دیا کرتی تھیں۔ ان کے والد

حاجی ظفر اللہ شہر کے نامی حکیم تھے، بچپن سے ذہین تھیں کوئی بیٹا تو تھا نہیں، باپ بہت کچھ انھیں ہی بتاتے رہتے تھے طب کی کتابیں بھی پڑھ لیتی تھیں۔ چھوٹی موٹی تکلیفوں کے نسخہ بھی معلوم ہو گئے تھے۔ باپ نے انتقال سے پہلے اپنی ساری دوائیں انھیں دے گئے تھے اور وصیت کر گئے تھے۔

"بیٹی اپنا علم تمھیں سونپ رہا ہوں معمولی نزلہ زکام، کھانسی، سر درد، بخار و دست کی دوائیں دینا تو جانتی ہی ہو غریبوں کی مدد کرو گی تو خدمت خلق بھی ہو گا اور ثواب بھی ملے گا۔"

تقریباً بیس سال سے وہ غریبوں کا دکھ درد بانٹ رہی تھیں گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ برابر دوائیں منگواتی رہتی تھیں۔ بختیار حسین بھی غریبوں کی بھرپور مدد کرتے تھے۔ کتنے لوگوں کو اپنے اثر و رسوخ سے نوکری دلواتے تھے۔ اسکول میں غریب بچوں کی فیس اور کاپی کتابیں مہیا کراتے تھے۔ غریب دامن پھیلا کر انھیں دعائیں دیتے تھے۔

بختیار حسین کے بیٹے تبریز حسین گاؤں سے ابھی لوٹے تھے۔ ہاشم گھر کے پرانے خادم تھے وہ دوڑ کر چمچماتے کٹورے میں پانی بھر لائے۔

تخت پر حسن آرا بیگم پان لگا رہی تھیں بیٹے انھیں کے پاس بیٹھ گئے۔

"امی جان گاؤں کے سبھی لوگ بہت یاد کر رہے ہیں کہہ رہے تھے کہ اماں جان اور بہو بیگم کو آئے بہت عرصہ گزر گیا۔ کچھ دن ہمارے ساتھ رہتی ہیں تو مولا قسم ہمارا دل خوش ہو جاوے ہے کیسی اچھی اچھی باتیں بتاتی ہیں پیغمبروں کے قصے سناتی ہیں"۔

ماں کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی" ہم بھی یاد کرتے ہیں ذرا سردی کھٹک جائے تو چلیں گے عظیمہ کی بیٹی کیسی ہے۔ دوا سے کچھ فائدہ ہوا اسے؟"

"بالکل ٹھیک ہو گئی بڑی دعائیں دے رہی تھی"

"دین دیال رام پیاری کا جھونپڑا بنوا دیا تم نے رسی بٹ بٹ کر ہاتھ میں گٹے پڑ گئے ہیں بیچاروں کے۔ مرہم دے آئی تھی کہ روز رات کو لگا کر سونا۔

"امی جان اس لیے تو سب آپ کو یاد کرتے ہیں اجمیر بی کی بیٹی کا گونا ہو گیا وہ دوسرے گاؤں چلی گئی ہے آپ نے جو سامان دیا تھا اسے پا کر خوشی سے رونے لگی بولی اماں جی نے تو ہماری عزت بڑھا دی ہم شکریہ کیسے ادا کریں بیچارے بابو لال کے دادا چل بسے" تبریز حسین نے پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''سائرہ کی ماں نے بیٹی کا رشتہ کہیں پکا کیا یا نہیں؟'' حسن آرا نے پوچھا۔

" ابھی نہیں، ہاں ایک خوش خبری ہے سرکار ہمارے گاؤں میں اسکول بنوانے کے لیے زمین دے رہی ہے میں نے عرضی دی تھی۔"

" یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی تعلیم بہت ضروری ہے لڑکے لڑکیوں، دونوں کے لیے"

خالدہ خانم باورچی خانے میں ناصرہ کے ساتھ کھانا بنوا رہی تھیں ناصرہ ہاشم کی بیوی تھیں۔ دونوں پچھلے تیس سال سے حویلی کے پچھواڑے خادموں کے لیے بنے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ وہیں دوسرے گھر میں سلیم اور نسیمہ رہتے تھے۔ ایک کواٹر میں سکھیا اور اس کے بیوی بچے رہتے تھے پہلے رواج تھا کی خادموں کے لیے حویلی کے احاطے میں ہی گھر بنوا دیتے تھے تا کہ انھیں آسرا مل جائے کیونکہ اکثر گھر گاؤں والوں کے ہی ہوتے تھے۔

ارے چھوٹو! ادھر تو آ۔

" جی مالکن نمستے" چھوٹو نے ہاتھ جوڑ دیے۔

" ابھی برسات شروع ہونے والی ہے۔ کچھ اچھے پھولوں کے نئے پودے لے آؤ۔

کیلے، آم، جامن، انار، پپیتے اور ہاں بانس کے بھی نئے پیڑ لگا دو گھاس بھی بڑی ہو گئی ہے پام اور گل مہر کے درخت کے پودوں کو بھی لگاؤ"۔

" جی میں کل ہی لے کر آتا ہوں۔"

" گاؤں گئے تھے اپنے، ماں کیسی ہے؟"

" کیا بتائیں، بہت روتی تھی، تو ہمیں چھوڑ کر مت جا کون گھڑی بھگوان جی کا بلاوا آ جائے"

" کون دیکھ بھال کر رہا ہے۔؟"

" ہمارے بھائی کی بٹیا میرا دیکھ بھال کر رہی ہے پر اب وہ بھی کہہ رہی تھی کہ دادی کو غصہ بہت آوے ہے کھانا بھی نہیں کھاتی ہے، بہت منوہار کر کے کھلاوے ہیں کتنا سمجھات ہیں نہ کھائے گی تو چل بھی نہیں پائے گی پر کہنا مانے تب نا! ہماری تو ایک نہ سنے ہے بابا تو ہی سمجھا۔"

" ماں کو یہاں لے آؤ علاج بھی ٹھیک سے ہو جائے گا میں تو کتنے دن سے کہہ رہی ہوں ماں کو اپنے ساتھ رکھو علاج بھی ہو جائے گا اور تمھیں دیکھ کر اس کا من چنگا رہے گا"

"غلتی ہو گئی اگلی بار جائیں گے تو لوا لائیں گے"

"نہیں، کل ہی جا کر اسے لے آؤ کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو ہم رب کو کیا منہ دکھائیں گے تمھارے ناتے ہماری بھی تو کچھ ذمہ داری ہے اماں جی

کی آواز میں غصہ تھا۔

خالدہ خانم کی بیٹی نکہت بمبئی پڑھنے گئی ہوئی تھی خالدہ کی بہن سمینہ بمبئی میں تھیں۔ وہ گھاٹ کوپر میں رہتی تھیں۔ بمبئی کی تعلیم بہت اچھی تھی، سمینہ کی بیٹی آصفہ اور نکہت میں بہت محبت تھی دونوں چرچ گیٹ کے لا کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ اب دونوں فائنل ائیر میں تھی پہلے تبریز حسین کا خیال تھا کہ بیٹی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھیجیں لیکن آصفہ نے اپنے خالو جان اور خالہ جان سے ضد کی کہ وہ اور نکہت ساتھ میں پڑھیں گے۔ نکہت کو بھی بڑے شہر میں پڑھنے کا شوق تھا حالانکہ ماں باپ کی جدائی بھی شاق تھی۔ ماں بھی اپنی اکلوتی بیٹی کو کسی صورت بھیجنے کو راضی نہیں تھیں۔ لیکن بیٹی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ یا تو ماں باپ بیٹی سے ملنے بمبئی جاتے تھے یا دیوالی کرسمس یا گرمی کی چھٹیوں میں سمینہ دونوں کو لے کر بہن کے گھر آجاتی تھیں۔ وہ برسات کی ایک شام تھی۔ کالے کالے بادلوں کی پرت پر پرت چڑھی چلی آرہی تھیں۔ ابھی شام کے پانچ ہی بج رہے تھے لیکن اندھیرا دیکھ کر لگتا تھا کہ سات بج رہے ہیں ہلکی ہلکی پھوار بھی آرہی تھی۔ سامنے دور تک باغ پھیلا ہوا تھا جس میں آم، پپیتا، امرود، کیلا، بیل، چکوترا، انار، املی اور جامن وغیرہ کے درخت تھے۔ دوسری طرف گل مہر، پام نیم کے سرسبز و شاداب درخت اگے ہوئے تھے۔ باغ کے درمیان میں گلاب، چمیلی، ہارسنگھار، چمپا، گل عباس، گل داؤدی، موگرا اور بھی پھولوں کے پودے تھے۔ گملوں میں بھی رنگ برنگ کے پودے تھے کئی طرح کے کیکٹس بھی تھے۔

شمالی سمت ترکاریوں کے پودے اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ مالی نے کل ہی بتایا تھا کہ اس نے ٹماٹر، لیمو، ہری مرچ، کریلا، تورئی، ہرا دھنیہ، پودینہ بھنڈی کے نئے بیج بھی بوئے تھے تاکہ ترکاری کواٹر میں رہنے والوں کو مل جائے۔

" ارے نکہت بٹیا! ہم تمھیں کھوج رہے تھے ہم نے سب کے لیے گرما گرم چائے اور پکوڑیاں بنائی ہیں۔ سب چمن والی چھتری میں آپکی راہ دیکھ رہے ہیں۔

ناصرہ نے بڑی شفقت سے نکہت کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

" ارے واہ! اس وقت ہمارا جی چائے کے ساتھ سچ مچ گرما گرم پکوڑیاں کھانے کو چاہ رہا تھا تم کتنی اچھی ہو، بوا!"

نکہت نے مسکراتے ہوئے کہا ناصرہ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، وہ نکہت کو اپنی بیٹی جیسا ہی پیار کرتی تھی۔

چمن میں ایک بہت بڑی اور خوبصورت چھتری بنی ہوئی تھی بیچ بیچ میں کئی کئی بانس ساتھ میں لگے ہوئے تھے اور ان پر پھولوں والی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔

بیچوں بیچ آبنوسی لکڑی کی ایک بڑی گول میز پڑی ہوئی تھی اور آبنوسی کرسیاں تھیں گھر کے سبھی لوگ وہاں بیٹھے تھے۔

> " دادا جان ! اب ہم اتنے برے بھی نہیں ہیں کہ لوگوں کو جھگڑا کرتے دیکھکر خوش ہوں کہ ہماری دکان تو چل رہی ہے — سچ تو یہ ہے کہ لوگ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا کرتے ہیں کہ مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے — میں تو زیادہ تر اپنے آپ ہی دونوں فریقوں کے بیچ جھگڑا نپٹا دیتی ہوں — عدالت پہونچنے ہی نہیں دیتی — خام خواہ وقت اور پیسے کی بربادی -چھوٹی سی زندگی..... اسے بھی جہنم بنا لینے میں کون سی عقل مندی ہے ؟"

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! آؤ بیٹی، ہم تمھارے ہی منتظر تھے" دادا جان نے اسے اپنے پاس والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

" یہ بتایئے وکیل صاحبہ کہ آپ کی وکالت کیسی چل رہی ہے آپ تو چاہتی ہوں گی کہ لوگ خوب جھگڑا کریں تاکہ آپ کی وکالت چمکے" دادا جان نے پوتی کو چھیڑا۔

" دادا جان! اب ہم اتنے برے بھی نہیں ہیں کہ لوگوں کو جھگڑا کرتے دیکھ کر خوش ہوں کہ ہماری دکان تو چل رہی ہے سچ تو یہ ہے کہ لوگ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا کرتے ہیں کہ مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے میں تو زیادہ تر اپنے آپ ہی دونوں فریقوں کے بیچ جھگڑا نپٹا دیتی ہوں عدالت پہنچنے ہی نہیں دیتی خواہ مخواہ وقت اور پیسے کی بربادی۔ چھوٹی سی زندگی..... اسے بھی جہنم بنا لینے میں کون سی عقل مندی ہے؟"

" شاباش! ہمیں اپنی بٹیا سے یہ ہی امید تھی توڑنا بہت آسان ہوتا ہے جوڑنا بہت مشکل اور دشوار کام ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو زندگی بھر عدالتوں کے چکر کاٹتے رہتے ہیں نہایت افسوس ہوتا ہے ایسے لوگوں کو دیکھ کر دین اور دنیا دونوں برباد اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔

" دادی جان مجھے آپ سے بہت شکایات ہیں" نکہت نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

" اے بی بی ! خدا خیر کرے تمھارے دشمنوں کی طبیعت تو کہیں ناساز نہیں ہے"

"قطعی نہیں سب بھلے چنگے ہیں امی جان ذرا آپ ہی دادی جان کو بتائیے کہ ہمیں کیا شکایت ہے؟"۔

" کیوں ہمیں ناحق کانٹوں میں گھسیٹتی ہو نکہت ! ہمیں تو تم نے کبھی کچھ نہیں کہا" خالدہ خانم نے گھبرا کر میاں کو دیکھا۔

" امی جان بتا دیجیے نا ! چھپانے کی کوئی بات تھوڑی نہ ہے" نکہت نے منہ بنا کر کہا۔

" اے لڑکی عقل کے ناخون لو" خالدہ روہانسی ہوگئی۔

" ارے خانم ہماری بیٹی کو اگر ہم سے کوئی شکایت ہے تو بتانے میں حرج ہی کیا ہے؟" دادی نے پیار سے پوتی کو دیکھا۔

" مجھے تو اس نے کوئی شکایت نہیں کی" ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

" شکایت وکایت ---یہ آج کون سا دکھڑا لے بیٹھی ہو؟"۔

" خالدہ حیرانی اور پریشانی سے بیٹی کو دیکھ رہی تھی انھوں نے تو کبھی شکایت کرنا سکھایا ہی نہیں تھا۔

" آپ نہیں بتاتی نا تو ہم بتاتے ہیں کہ ---کہ ہمیں اپنی پیاری دادی جان سے کیا شکایت ہے؟ نکہت نے اٹھ کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دی۔

'' ہمیں تو اپنی اتنی پیاری دادی جان سے کوئی شکایت ہی نہیں ہے'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

" اللہ قسم !تم نے تو ہمیں کٹگھرے میں ہی کھڑا کر دیا تھا"۔

" وکیل ہوں نا ! نکہت ہنس پڑی گھر کے سبھی لوگ ہنسی میں شامل ہو گئے۔

"للن کو ہم گاؤں بھیج رہے ہیں ان کی بیٹی سریتا اور شیلا کی بیٹی نے بھی انٹر پاس کر لیا ہے-اب وہ یہیں رہ کر اپنی تعلیم پوری کریں گی کوٹھی کا ایک کمرہ ان کے لیے صاف کرا دیجیے"

" امی جان ! ناظمہ، تسنیم اور عائشہ نے بھی انٹر پاس کر لیا ہے انھیں بھی بلا لیجیے، سب ساتھ رہیں گی میں تو چاہتا ہوں کہ گاؤں کی کوئی بھی بچی تعلیم سے محروم نہ رہیں" تبریز حسین نے کہا۔

" انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا سرکار نے جو زمین دی ہے اس کا افتتاح اگلے ہفتے ہوگا۔ ڈگری کالج بن جائے گا تو سب وہیں رہ کر آگے پڑھ سکتے ہیں لوگوں نے بھی بہت مدد کی ہے بڑے لوگوں نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دریا دلی سے ہمارے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے مدد کی ہے اور حکومت بھی بھرپور مدد کر رہی ہے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے الگ کالج ہوگا ہوسٹل بھی بنوائیں گے تا کہ اندر کے گاؤں سے آنے والے بچے بھی وہیں رہ کر پڑھ سکیں۔ امی جان آپ کا خواب ضرور پورا ہوگا دین اور دنیاوی دونوں کی تعلیم ضروری ہے حکومت بھی ہماری مدد کر رہی ہے۔

گاؤں میں جشن کا ماحول ہے۔کالج اور ہاسٹل بن کر تیار ہو چکے ہیں۔آج وزیر تعلیم افتتاح کر رہے ہیں۔حسن آرا بیگم نہایت خوش ہیں اعلی تعلیم سب حاصل کر سکیں گے کوئی تعلیم سے محروم نہیں رہے گا۔ سورج نکلتا ہے تو روشنی چھا جاتی ہے تعلیم روشنی ہی ہے استاد استانیوں کے رہنے کے لیے کالج کے ساتھ ہی بلڈنگیں بن چکی ہیں تا کہ جن لوگوں کے پریوار ہیں وہ اپنے پریوار کے ساتھ رہ سکیں۔

وزیر تعلیم نے کہا---" اس طرح اگر آپ لوگ آگے بڑھ کر خود کوشش کریں گے تو تعلیم کو بہت فروغ ملے گا۔ گاؤں میں بدلاؤ لائے بنا ہماری ترقی ادھوری رہے گی۔ہمیں دیہات، قصبہ اور چھوٹے شہروں کو مین اسٹریم میں شامل کرنا ہے جس طرح چھوٹے پودے کو زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ درخت بن جاتا ہے تو اپنے آپ پھلتا پھولتا ہے۔ چھوٹے شہر، گاؤں، قصبے کی ترقی کا مطلب ہے سب کی ترقی اس لیے ہمارا مقصد سب کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ تعلیم آج کی بنیادی ضرورت بن چکی ہے آج ہم آپ کو خوش خبری دینا چاہتے ہیں یہاں کرشی کالج بھی بنے گا اور صاف صفائی کے لیے گاؤں کو ایوارڈ دیا گیا ہے۔ اس گاؤں نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر جذبہ سچا ہو اور محنت بھرپور ہو، دونوں میں کمی نہ ہو تو بہت جلد کایا پلٹ ہو سکتی ہے ۔حسن آرا کو بھی وزیر تعلیم نے اعزاز دیا ہے۔

خواب تو انھیں کا تھا!

□□□

Dr.Nghma Javed Malik
B-1,Gautam Apartment
Seven Bungalows
Andheri West
Mumbai-400053 (M.S)

حیاتِ الفت

فاضلہ الفت

میں تیز قدموں سے زینوں سے اتر رہی تھی، معلوم پڑتا تھا کہ انھیں پھلانگ جاؤں گی۔ کسی نے ڈور بیل بجائی تھی۔ اس امید کے ساتھ کہ وہاں تم ہوگی میں ہر شے کو نظر انداز کر دوڑتی ہوئی دروازے تک آئی۔

''اف ف ف۔۔۔! تم نے تو ہمیں منتظر فرد ابنا ڈالا یار!''

میں نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔

''آپ کے شکوے اچھے لگتے ہیں محترمہ! میں مزید شکوے کی خواہش رکھتی تھی اس لیے ایسا کیا۔''

اس نے بے اختیار کہا۔ اور مجھے ہنسی آ گئی۔

''اب اندر بھی بلاؤ مجھے یا سارے شکوے دروازے پر کرنے کا ارادہ ہے!؟''

میں نے نظریں نیچی کر کے کہا ''نہیں!''

ہم نے لان سے زینے تک کے سفر میں باتیں جاری رکھیں اور اب ہم پوری طرح گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کی آواز سن کر اماں بھی کچن کے کام چھوڑ کر ہماری جانب آتی ہوئی نظر آئیں۔ رسماً سلام دعا کے بعد ہم اپنے پسندیدہ کمرے میں آ گئے۔ ہم دونوں کی باتیں اب بھی جاری تھیں۔

''اس دفعہ کتنے دنوں پہ ملاقات ہے ہماری!'' اس نے پوچھا۔

''یاد نہیں! ہاں مگر ایک طویل انتظار کے بعد رہی۔''

میں نے آخری ملاقات کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

اس نے بھی حامی بھری اور اب ہمارے بیچ کچھ دیر کی خاموشی چھا گئی۔

''ہمارے بیچ خاموشی اچھی نہیں لگتی نا۔''

اس نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا:

''بالکل نہیں!''

میں نے کہا۔

اور ہمیں بے اختیار ہنسی آ گئی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ یوں کھانے پینے اور باتوں میں پتا ہی نہیں چلا کہ 3 گھنٹے گزر چکے ہیں۔ شام کے چھ بجنے کو تھے۔ ساتھ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ہم نے ایک گہری نگاہ گھڑی پہ ڈالی جیسے ہم اس سے مودبانہ گزارش کر رہے ہوں کہ کچھ مہلت دے دے۔ پھر ایک دوسرے سے نظریں ملائیں جہاں مایوسی صاف نظر آ رہی تھی۔ گزرتے وقت میں اس مایوسی کو دور کرنے کے لیے میں نے باتوں کے 'اور' ڈھونڈتے ہوئے کہا:

''تمھاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں! بالکل قاتلانہ۔''

اور وہ زور سے ہنسی۔

''بعض دفعہ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم میری معشوقہ ہو!''

اس نے میری کھینچائی کی اور میں نے دل ہی دل میں کہا:

"میں ایسے دوست کی خواہش رکھتی ہوں جس کے لیے ملاقات شرط نہ ہو—! فاصلے چاہے جتنے ہوں مگر آئے دن وہی جوش مارتی دوستی ہو۔ جس کی آواز کانوں میں رس گھولے اور اس کا وجود مساموں کو معطر کر دے۔ جب میری آنکھیں نم ہوں تو وہ شریکِ غم ہو۔ جو میری خاموشی کو سمجھے اور چہرے کو پڑھ لے۔"

"یہ سچ ہے۔تم اسے تسلیم کیوں نہیں کرتیں!"

سرد ہوائیں ہمارے جسم کو چھو رہی تھیں۔ کھلے آسمان کے نیچے ہم ان ستاروں کو دیر تک تکتے رہے۔ کبھی ہم انھیں گننے کی کوشش کرتے تو کبھی ان میں تصویریں تلاش کرتے۔

"کوئی غزل یاد ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تمھیں دیکھ کر دیوان نہ یاد کر لیں ہم!" اور اس کی ہنسی فضا میں رس گھول گئی۔

دیر تک خاموشی کے بعد اس نے اچانک پوچھا۔

"تمھاری زندگی میں میرا کیا مقام ہے؟"

میں نے اس کی ان خوبصورت آنکھوں میں دیکھ کر کہا:

"میری آنکھوں میں دیکھو۔کیا نظر آتا ہے؟"

"میرا عکس" اس نے کہا۔

میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا:

"ہر انسان کو ایک ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی رشتے کی شکل میں ہو سکتا ہے اور میرے نزدیک سب سے خوبصورت رشتہ دوستی کا ہے۔

میں ایسے دوست کی خواہش رکھتی ہوں جس کے لیے ملاقات شرط نہ ہو—! فاصلے چاہے جتنے ہوں مگر آئے دن وہی جوش مارتی دوستی ہو۔ جس کی آواز کانوں میں رس گھولے اور اس کا وجود مساموں کو معطر کر دے۔ جب میری آنکھیں نم ہوں تو وہ شریکِ غم ہو۔ جو میری خاموشی کو سمجھے اور چہرے کو پڑھ لے۔ اس کا ساتھ اور موجودگی مجھے بہت عزیز ہو۔ جسے کھونے کا ڈر ہو اور اس کے سوا غم یار کا کوئی نہ در ہو۔ کبھی مجھ سے کوئی پوچھے کہ کتنے دوست ہیں تو سوائے اس کے میری آنکھوں میں کسی کا عکس نہ ٹھہرے۔ کبھی ہماری تھوڑی لڑائی ہو جائے تو وہ اسے خوبصورت بنانے کا فن رکھتا ہو۔ کبھی جو اختلافات کے طوفان آئیں تو ہماری دوستی کے بندھن کو دیکھ کر شرم سے وہ اپنا رخ بدل لیں۔ جب وہ کہے کہ میں تمھاری 'بیسٹ فرینڈ' ہوں تو میں اس سے مذاق کرتے ہوئے کہوں کہ ایک ہی دوست ہے میرا اب وہ بیسٹ ہو چاہے ویسٹ!"

"وہ غمگسار، یارِ غار، میرا خلیل، رفیق، آشنا ہو۔"

وہ یوں ہتھیلیوں پہ ٹھوڑی رکھ کر مجھے غور سے سن رہی تھی۔ میں نے اس کے کان میں ہولے سے کہا:

"وہ حیات الفت ہو۔"

اس کے چہرے پہ ایک خوبصورت مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اپنی ہتھیلی دکھاؤ مجھے۔"

میں نے اس سے کہا اور خود اپنی ہتھیلی کو اس سے جوڑ کر کہا:

"ان دو ہتھیلیوں کے جڑنے پر کیا نظر آیا تمھیں!"

"آدھے دل کے حصے جڑ کر ایک دل بنتے دکھے۔"

اس نے معصومیت سے کہا:

"اور وہ نام نظر نہیں آیا!"

ہم دونوں ہنس پڑے۔

"جانتی ہو اس کا کیا مطلب ہے!"

"نہیں!"

اس نے اپنی نظروں کو ذرا نیچے کر کے کہا۔

"یہ آدھے دل اور آدھے نام ہمیں مکمل کرتے ہیں۔ الفت کے بغیر حیات نہیں ہوتی اور حیات نہ ہو تو الفت کا وجود قائم رہنا ناممکن ہے!"

وہ مسکرائی اور بے ساختگی سے پوچھا:

"ارے تم نے یہ نہیں بتایا کہ اللہ نے وہ دوست تمھیں عطا کیا ہے جس کی تم خواہش رکھتی ہو!"

میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی کہ

"کچھ لوگوں کو اللہ توقع سے بڑھ کر دیتا ہے!!"

اور ہم مسکرائے۔

□□□

Fazela Ulfat

Domanpura, Teleyana

Maunath Bhanjan

Mau- 275101 (UP)

قبل از وقت مینو پاز

ڈاکٹر خان شہناز بانو

دور حاضر میں خواتین کی صحت بہت سے بحران سے گزر رہی ہے۔ خواتین کو گھر اور معاشرہ دونوں سے مدد اور صحیح شناخت چاہیے۔ اگر ان سے جڑے مسائل کی بات کریں تو ایک طویل فہرست تیار ہوسکتی ہے۔ اس ضمن میں قبل از وقت مینو پاز یا حیض کی بندش ایک بہت اہم موضوع ہے جس کے تعلق سے خواتین اور بچیوں میں اور معاشرے میں آگاہی ہونا ضروری ہے۔ خواتین میں آگاہی ضروری ہے کیونکہ وہ بھی شرم یا خوف کی بناء پر خاموشی سے مینو پاز کی اذیتوں کو اکیلے ہی جھیلنے پر خود کو مجبور کرتی ہیں۔ ایک سروے کے مطابق 2030 تک دنیا میں مینو پاز اور پوسٹ مینو پازل خواتین کی تعداد 2.1 بلین تک پہنچنے کے قوی امکانات ہیں۔ اوسطاً ہر سال تقریباً 47 ملین خواتین مینو پاز کا سامنا کرتی ہیں۔ اس مسئلہ کا ہم سطحی جائزہ لیں گے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ خدا نے اپنی منفرد صفات میں سے ایک صفت عورت کو دی ہے اور وہ ہے تخلیقی یا پیدا کرنے کی صلاحیت۔ لیکن اس صلاحیت کے لیے خواتین کو ایک خاص دور سے گزرنا ہوتا ہے، قدرت نے ہر لڑکی کے تولیدی نظام کے بیضہ دان میں مخصوص تعداد میں انڈے رکھے ہیں، وہ مخصوص انڈے جب تک بیضہ دان میں پیدا ہوتے رہتے ہیں تو ماہواری کا عمل چلتا رہتا ہے۔ اور اسی بنا پر وہ حاملہ ہونے کی اہل ہوتی ہے ساتھ ہی ہارمونز کی سطح بھی صحیح رہتی ہے۔ جیسے ہی انڈوں کی افزائش بند ہوجاتی ہے حیض کا عمل رک جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی ہارمونز میں بھی غیر استدلالی آجاتی ہے۔ ایف ایس ایچ اور ایسٹروجن کی سطح خراب ہونے کی وجہ سے مزاج میں اتار چڑھاؤ کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ ایسٹروجن کی پیداوار کی کمی تولیدی عمل کو روک دیتی ہے اور یہیں سے شروع ہوتا ہے مینو پاز کا دور جو کئی سال تک جاری رہتا ہے۔ چونکہ ہمارے معاشرے کی خواتین میں آگاہی کی حد درجہ کمی ہے اور اچانک ماہواری کا رکنا اور اس سے منسلک علامتوں کے ظاہر ہونے پر خواتین میں ذہنی دباؤ بڑھ جاتا ہے اور آگے چل کر نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

مینو پاز کیا ہے؟

اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے ایک واقعہ کا ذکر کرتی ہوں۔ ہمارے گھر پر بیٹی کو عربی تعلیم دینے کے لیے استانی آتی تھی۔ ان کی عمر تقریباً 40 سال تھی۔ کچھ عرصے سے بہت پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ مزاج کی بہت نرم اور وقت کی پابند تھی لیکن اس دوران ان میں حد درجہ غصہ اور چڑچڑاپن دکھائی دے رہا تھا۔ ایک روز میں نے ان کے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ وہ بے ساختہ رونے لگیں اور کہا کے 2 ماہ سے مجھے ماہواری نہیں آئی ہے۔ اگر اس عمر میں حاملہ ہوئی تو بچے اور لوگ کیا کہیں گے؟ جب ہم نے ان سے دیگر علامتوں کا پوچھا تو سمجھ میں آیا کہ وہ مینو پاز کے دور میں ہے۔ مینو پاز کے دوران یا اس کی آمد سے تھوڑے پہلے یا بعد میں مندرجہ ذیل کیفیت / علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ مینو پاز سے منسلک

علامات چند نہیں بلکہ ایک طویل و وسیع سلسلہ پر مبنی ہے۔مینو پاز کے مراحل کی مناسبت سے علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

1۔ ماہواری میں بے قائدگی۔پری مینو پاز کی شروعات۔
2۔ حیض کے بہاؤ میں زیادتی اور بھاری پن۔
3۔ پچھلے 12 مہینوں سے حیض نہ آنا۔
4۔ ایسٹروجن اور پروجیسٹرون (جنسی وتولیدی) ہارمون کی سطح میں کمی۔
5۔ مزاج میں تبدیلی، بے چینی، مزاج کی تبدیلیاں، عزت نفس میں کمی۔
6۔ دماغی بوجھل پن، ذہنی دھند، یادداشت میں کمی۔
7۔ گرمی لگنا مینو پاز میں منتقلی کا مرحلہ۔
8۔ سونے میں دشواری۔پری مینو پاز ومکمل مینو پاز۔
9۔ دل کی دھڑکنوں میں بے اعتدالی، بے قاعدہ دھڑکن۔معمول سے تیز چلنا۔ہارمون میں تبدیلی۔
10۔ سردرد، آدھے سر کا درد، دردشقیقہ، مائگرین، پٹھوں کا درد، جوڑوں کا درد۔
11۔ فربہ دار جسم، جسم کی ہیئت میں نمایاں تبدیلی۔
12۔ جلد کا خشک ہونا، خارش ہونا، ناخن کا بھربھرا پن۔
13۔ شہوت میں کمی، اندام نہانی میں دردوجلن، جماع کے دوران درد، ضرورت سے زائد فعل مثانہ۔
14۔ پیشاب کی نالی کے انفیکشن۔مینو پاز کے دوران اور اس کے بعد۔
15۔ ہتھیلی اور تلووں میں جلن، منہ کا جلنا، تھکاوٹ، پیٹ کا پھولا ہوا ہونا۔ہاضمے کے مسائل، بالوں کا جھڑنا اور پتلا ہونا۔

اس طرح جسم ان تبدیلیوں کو مختلف ردعمل کی شکل میں ظاہر کرتا ہے جو ممکن ہے زیادہ تر خواتین میں حیض بند ہونے سے پہلے سے ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے اسے مینو پاز کہتے ہیں۔بلوغت سے جاری ماہواری کا سلسلہ عام طور پر پچاس سال کی عمر تک جاری رہتا ہے۔اس عمر کے بعد یہ عمل بند ہو جاتا ہے۔یہ ایک عمومی عمل ہے اور ہر خاتون (اے۔ایف۔بی) جسے حیض آتا تھا اس سے گزرتی ہے۔

Average women or person assigned
-AFABfemale at birth

لیکن چند خواتین میں یہ اڑتالیس تو چند خواتین میں چالیس سے پہلے ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔اسے قبل از وقت مینو پاز کہتے ہیں۔

مینو پاز کی تشخیص:

مینو پاز یعنی ہارمونز کی سطح میں گراوٹ، اس طرح خون کی جانچ کے ذریعے ایف۔ایس۔ایچ (فولیکل اسٹیمولیٹنگ ہارمون) کی سطح کی جانچ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔لیکن ان نتائج پر ہی مکمل اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔خاص کر اگر عمر 45 ہے یا اس سے تجاوز کر چکی ہو۔ڈاکٹر اور کیس ہسٹری ہی صحیح تشخیص کر سکتی ہے۔

Early Menopause ((PMM Premature
(EM) قبل از وقت مینو پاز اور غیر پختہ مینو پاز:

قبل از وقت مینو پاز اور غیر پختہ مینو پاز میں فرق یہ ہے کہ جب

مینوپاز 45 سال سے پہلے ہووہ قبل از وقت مینوپاز کہلاتا ہے جبکہ اگر یہی صورتحال 40 سے پہلے رونما ہووہ غیر پختہ مینوپاز کہلاتا ہے۔اس بنا پر بہت سے صحت سے جڑے عارضے جیسے- Cardiovascular, Neurological Diseases, Mood, Disorders, Osteoporosis, Disorders Psychosexual premature deathdysfunction لاحق ہوتے ہیں۔

غیر پختہ مینوپاز 40 سال سے کم عمر والی خواتین میں 1 فیصد پایا جاتا ہے۔جبکہ 30 سال سے کم والی خواتین میں اس کا تناسب 1.0 فیصد ہے۔ان کی علامتیں مینوپاز کی علامتوں سی ہی ہوتی ہیں۔یہ عمل قدرتی ہو یہ ضروری ہے جبکہ چند مینوپاز قدرتی نہ ہوتے ہوئے ترغیب زدہ یا زبردستی لائے ہوئے ہوتے ہیں جیسے میڈکل ٹریٹمینٹ،سرجیکل،میڈیکیشن سے بھی یہ شکایت لاحق ہوتی ہیں۔اکثر اس کی وجہ جینیٹک ڈس آرڈر یا ایبنارمیلیٹی، آٹوامیون ڈیزیزیس یا میٹابالک ڈس آرڈر یا انفیکشن بھی ہوسکتے ہیں۔اس کے علاوہ جلد حیض کا آنا،جینس،اپیلیپسی-مرگی اور سگریٹ نوشی بھی اس کی وجوہات میں شامل ہیں۔کیموتھیراپی یا پیلویک ریڈی ایشن، کروموزوم کی کمی بھی اس کی وجہ ہیں۔90 فی صد خواتین جو اس کا شکار ہیں ان کی اصل وجہ کو ابھی تک جان نہیں پائے ہیں۔2017 کی ایک اسٹڈی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو خواتین ریفائینڈ پاستا یا چاول کا زیادہ استعمال کرتی تھی ان میں غیر پختہ مینوپاز کی شرح زیادہ ہیں۔

مینوپاز کے بعد ہونے والے مسائل کو روکنے کے لیے پری مینوپاز کا وقت کا صحیح استعمال

تحقیق اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگر خواتین پری مینوپاز کے دور سے ہی اپنی صحت کا خیال رکھے تو مینوپاز کے بعد ہونے والے کئی مسائل سے بچ سکتی ہے جیسے موٹاپا وغیرہ۔مینوپاز سے پہلے جسم بہت مختلف طریقے سے برتاؤ کرنا شروع کردیتا ہے اور بہت سی خواتین میں ماہواری کے حقیقی طور پر رکنے سے بہت پہلے ہی اس کی علامات شروع ہوجاتی ہیں۔اس مرحلے کو پری مینوپاز کہا جاتا ہے۔وقت رہنے کی گئی ورزش مینوپاز کے مسائل کو کم کرتی ہے۔ان میں چہل قدمی کرنا، ہلکی ورزش اور وزن اٹھانا شامل ہے۔یہ ورزش پٹھوں کو مضبوطی دیتی ہے ساتھ ہی ہڈیوں کی کثافت میں اضافہ کرتی ہے۔اس طرح ہڈیوں کو بھربھرے ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔موبائل فون کا استعمال بچے کثرت سے کرنے لگے ہیں۔60ویں سالانہ یورپین سوسائٹی برائے اطفال اینڈوکرائینولوجی کی میٹنگ میں اس بات کی سفارش کی گئی کہ مسلسل نیلی روشنی جو موبائل اور لیپ ٹاپ سے خارج ہوتی ہے وہ عنفوان شباب کو وقت سے پہلے ہونے کے خدشات کو تقویت دیتی ہے۔کیونکہ یہ روشنی ہارمون کی سطح پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے اعتدال کو متاثر کرتی ہے۔

مینوپاز سے گزرنے والی خواتین کے لیے صلاح:

مینوپاز کے مسائل سے لڑنے کا واحد راستہ آگاہی ہے۔جیسے جیسے خواتین اسے ایک نارمل دورانیہ زندگی کے طور پر قبول کریں گی،اس کے منفی اثرات اتنی تیزی سے مند ہونگیں۔یہ زندگی کا اختتام نہیں بلکہ اس کے ساتھ خود کو ڈھالنا ضروری ہے۔اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے پر ناامید نہیں ہونا چاہیے۔گھر کے افراد خاص کر خاوند کی مدد اور سہارے کی بہت ضرورت ہوتی ہے،اس لیے ان کی بھی آگاہی کروانا ضروری ہے۔ہلکے سوتی کپڑوں کا استعمال، باقائدہ سے ورزش،متوازی غذا ،غذا میں کیلشیم اور وٹامن کا اضافہ اور ذہنی صحت کو بہتر بنائے رکھنے کے لیے کسی نہ کسی ایکٹیویٹیز میں خود کو مصروف رکھنے سے اس کے منفی اثر کو کم کیا جاسکتا ہے۔ضرورت محسوس ہو تو ماہر نسواں سے رابطہ کریں۔ ذیل میں درج چھوٹی سی نظم اس موضوع کو ایک اچھوتے انداز میں بیان کرتی ہے۔

□□□

Dr. Khan Shahnaz Bano
Principal & Associate Professor
Maulana Azad National Urdu University
College of Teacher Education
Aurangabad (M.S)
Mobile No: 9890953124

مراسلہ

ماہ اگست 2023 کا 'خواتین دنیا' نظرنواز ہوا۔ سرورق پر مجاہدین آزادی کی خوبصورت تصویریں موجود ہیں۔ سروجنی نائیڈو، بیگم حضرت محل، جھلکاری بائی، مہارانی لکشمی بائی، عزیزن بائی، بی اماں، بیگم حسرت موہانی، کستور با گاندھی اور وجے لکشمی پنڈت یہ وہ بہادر خواتین ہیں جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا اور اپنی جان کی قربانی دینے سے بھی نہیں گھبرائیں۔ ان تمام خواتین کی قربانیوں کو رہتی دنیا تک ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس شمارے کا اداریہ بھی جنگ آزادی پر ہی لکھا گیا ہے۔ جہان نسواں کے تحت دیے گئے تمام مضامین لائق توجہ ہیں۔ تعلیم نسواں کے تحت دو مضامین دیے گئے ہیں جس میں ''خواتین کی تعلیم اور خواندگی کی ذمہ داریاں'' اور ''خواتین کو با اختیار بنانے میں تعلیم کی اہمیت'' جیسے عنوانات پر مشتمل مضامین موجود ہیں۔ ڈاکٹر سمیہ ساجد اور سیدہ تبسم منظور ناڈکر کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ افسانوں میں ''سازِ وصل'' اور ''قصہ تیرے نام کا'' دونوں ہی کہانیاں اچھی لگیں۔ صحت کے تحت مضمون میں وٹامن سی کی کمی سے ہونے والی بیماریوں کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قارئین کے خطوط میں قارئین کی رائے سے روبرو کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

غرض ہر لحاظ سے یہ شمارہ قابل توجہ اور لائق تحسین ہے۔
'خواتین دنیا' کے تمام قلمکاروں کو مبارکباد۔

شبینہ بیگم، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

لسانی مطالعے

مصنف: گیان چند

پانچویں اشاعت: 2023

صفحات: 232

قیمت: 145 روپے

مولانا آزاد اور ہندوستانی قوم کی تعمیر

مصنف: رضوان ظہیر

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 425

قیمت: 240 روپے

پریم چند باتصویر سوانح

مصنف: کمل کشور گوئینکا

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 92

قیمت: 80 روپے

کلیاتِ پریم چند جلد 9

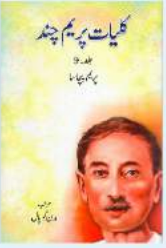

مرتب: مدن گوپال

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 616

قیمت: 335 روپے

اصولِ تعلیم

مصنف: خواجہ غلام السیدین

چھٹی طباعت: 2023

صفحات: 376

قیمت: 215 روپے

زبان اور قواعد

مصنف: رشید حسن خاں

چھٹی طباعت: 2023

صفحات: 406

قیمت: 225 روپے

پنڈت بدری ناتھ سدرشن

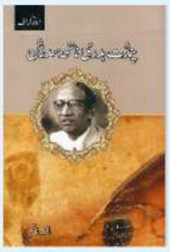

مصنف: الف ناظم

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 132

قیمت: 100 روپے

بشر نواز

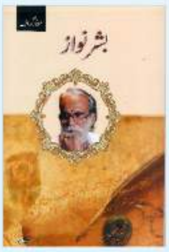

مصنف: صابر

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 145

قیمت: 105 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, सितम्बर- २०२३ वर्ष:७, अंक: ६
Mahnama Khawateen Duniya Monthly September 2023 , Vol. 7, Issue: 9
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-09-2023
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 ، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025